اکتوبر ۱۹۶۲ء

نگار

قیمت ۸؍

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھا صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

۱- اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ وو جر یا وی، پی کے ذریعہ وصولی منظور نہیں
۲- جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا۔
۳- اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط وکتابت طے ہوسکتا ہے

منیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر........ پانچ روپیہ
ششماہی ہندوستان کے اندر....... تین روپیہ
سالانہ بیرون ہند.......... بارہ شلنگ
ششماہی بیرون ہند......... ۷ شلنگ

نوٹ :- رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوجاتا ہے ۲۵- تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہوسکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔
حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط وکتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

"منیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار وجواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار وجواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی وتنقیدی مسائل شامل ہیں۔

قیمت :- جلد اول سے؍
جلد دوم سے؍
علاوہ محصول۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔
جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشا دہیں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ۔ جس میں ۳۲-افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں زبان، قدرت بیان، علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی ومعاشرتی مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی ونفسانی اہمیت پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے؍)
علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (تے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی بقرہ

شمار (۴)	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۶ء	جلد (۳۰)

ملاحظات ———— ۲
سید سلیمان ندوی کی فنی و تاریخی غلطیاں ———— عبدالمالک آروی ———— ۹
حسن اور کشاکش غمزہ ———— ۲۷
سوئٹزرلینڈ کے وفاق کی چند خصوصیات ———— ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا ———— ۳۱
ایک مرزنگ اور دو افسر ———— ۳۶
جاپان کا مسئلہ آبادی ———— عبدالرحیم شبلی ———— ۴۴
ہندوستان کا ایک مذہبی قاید اور اسکی قوت عمل ———— ۴۹
بانو ———— اختر انصاری بی ۔ اے ———— ۵۲
ترکی جمہوریت کے دس سال ———— سید بادشاہ حسین ———— ۵۵
مذاہب اربعہ میں فطرت کا لگاؤ ———— ہوش بلگرامی ———— ۶۲
مکتوبات نیاز ———— ۶۸
باب الاستفسار ———— ۷۰
مطبوعات موصولہ ———— ۷۵

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد (۳۰)	اکتوبر سنہ ۳۶ء	شمار (۴)

ملاحظات

ہماری بیماری اور اس کا علاج

(۲)

مذہبی درسگاہیں

اگست کے ملاحظات میں، اس موضوع پر میں صرف اس نتیجہ تک پہونچا تھا کہ ایک ملک یا قوم کی فلاح و ترقی کا تنہا ذریعہ صرف تعلیم کا عام ہونا ہے اور تا وقتیکہ تمام اجتماعی قوت اسی کے لئے وقف نہ ہو جائے ہم نہ ملک کو آزاد کرا سکتے ہیں اور نہ کسی نہج سے اُسے ترقی یافتہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے بڑے دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ تعلیم سے مراد کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے عام ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

آج کی صحبت میں صرف اس حصۂ بحث کو پیش کروں گا جس کا تعلق مذہب اور اس تعلیم سے ہے جو مذہب کے زیر اثر رائج ہے ۔۔ قبل اس کے کہ تعلیم کی حقیقت پر غور کیا جائے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ آیا مقصود بالذات

نفس تعلیم ہے یا کوئی اور چیز، یعنی چند کتابوں کا پڑھ لینا صرف اس خیال سے کہ اُن کا نگاہ سے گزر جانا ضروری ہے، ہمارے مقصد کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔

ظاہر ہے کہ کتاب نام نہ کاغذ و سیاہی کا ہے، نہ حروف و نقوش کا بلکہ اس سے مراد ایک مخصوص مفہوم ہے جو ذہن انسانی کو متاثر کرے اور قوت مدرکہ کو کسی نتیجہ تک پہونچنے میں مدد دے۔ اس لئے اس سے انکار ممکن نہیں کہ تعلیم کا مقصود صرف ذہن و دماغ کی تربیت ہے اور کتابیں محض آلہ و ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اب اس کے بعد غور طلب امر یہ ہے کہ تربیت ذہن و دماغ کیا چیز ہے۔ کہا جاتا ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہیں کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت تمدن پسند واقع ہوا ہے، یعنی ماحول اور وقت و ضرورت کے اقتضاء کے لحاظ سے اپنے اعمال و حرکات میں تبدیلی پیدا کر لینا اس کی خصوصیت خاصہ ہے۔ اس لئے ایک صحیح تعلیم کا معیار اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے والی ہو اور تعلیم یافتہ انسان ہم اسی کو کہہ سکتے ہیں جو یہ اہلیت اپنے اندر رکھتا ہو۔ الغرض اسلوب تعلیم کوئی مستقل قایم رہنے والی چیز نہیں ہے اور وہی قوم صحیح معنی میں متمدن کہلائی جا سکتی ہے جو وقت کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر اس میں تغیر و تبدل کرتی رہے۔ گویا تعلیم کا اساسی خیال ہی فکر و رائے کی آزادی پر منحصر ہے اور اس لئے ظاہر ہے کہ وہ تعلیم جو ذہنی آزادی کو چھین لینے والی ہے کبھی صحیح معنی میں تعلیم کہلائے جانے کی مستحق نہیں۔

آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تمام وہ اقوام جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں زندگی کا ثبوت دیا ہے، وہی تھیں جنھوں نے قوم کی تعلیم و تربیت میں آزادی خیال کو پیش نظر رکھا۔ چنانچہ خود مسلمانوں نے اپنے دور ترقی میں غیر زبانوں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کر کے افراد قوم کو جس طرح نئے خیالات سے آگاہ کیا وہ بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے اور اقوام مغرب نے جس طرح دنیا کی ہر اچھی تعلیم کو حاصل کر کے ترقی کی نئی نئی راہیں اپنے لئے کھول لیں وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ پھر اب ساتھ ہی ساتھ آپ اس پر بھی غور کیجئے کہ جو زریں اُصول تعلیم و تربیت کا مسلمانوں نے قایم کیا تھا، اُس سے وہ کیوں منحرف ہو گئے اور مغربی اقوام جو اب تک اس پر قایم ہیں سو کیوں؟

ممکن ہے بعض حضرات کو مجھ سے اختلاف ہو لیکن میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا سبب مجھے صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں نے آہستہ آہستہ اپنی تعلیم کا نظام مذہب کے ہاتھ میں دیدیا اور اہل مغرب نے اس کو مذہب سے متعلق ہونے نہیں دیا۔

اب سے تقریباً ایک ربع صدی قبل تک بلکہ اب بھی اکثر مسلم خاندانوں میں بچے کے سامنے سب سے پہلے جو کتاب رکھی جاتی ہے وہ "قاعدۂ بغدادی" ہے یعنی حروف تہجی اور اس کے مرکبات کا وہ اسلوب تعلیم جو عربی تعلیم کے لئے بغداد میں رائج تھا یا ہے۔ بغداد میں چونکہ عام زبان عربی ہے اس لئے یہ کتاب وہاں کے لئے موزوں ہو سکتی ہے

لیکن ہندوستان میں، جہاں مسلمان بچوں کی مادری زبان اُردو ہے قاعدہ بغدادی کی تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ انھیں قرآن شریف پڑھنے کے لئے طیار کیا جائے۔ چنانچہ عام طور پر دستور یہی رائج ہے کہ قاعدہ بغدادی کے بعد پارۂ عمّ شروع کر دیا جاتا ہے اور اس کے حفظ کرنے پر بچوں کو مجبور کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کلام مجید کا مطالعہ ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن اس مطالعہ کا وقت سن شعور میں پہونچنے کے بعد شروع ہوتا ہے، ناسمجھ بچوں کے سامنے کلام مجید رکھدینے کے معنے صرف یہ ہیں کہ ابتدا ہی سے اُن کے ذہن میں یہ بات پیدا کر دیجائے کہ مذہب و تعلیم مذہب سمجھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف کورانہ تقلید سے ہے۔ اسی کے ساتھ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ قرآن شریف کے لئے رحل کا ہونا بھی ضروری ہے ایک خوشنما غلاف یا جزودان بھی اس کا جزو لاینفک ہے اور بغیر جلد کو بوسہ دئے ہوئے پڑھنا بھی ممنوع ہے تو اس کی یہ پست ذہنیت آہستہ آہستہ اتنی مستحکم ہو جاتی ہے، کہ جوان ہونے اور سن وقوف تک پہونچنے کے بعد بھی وہ اسی میں مبتلا رہتا ہے اور قرآن شریف کے متبرک ہونے کا خیال دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔ وہ قرآن شریف کو اس لئے گھر میں رکھتا ہے کہ اس سے بلائیں دور ہوتی ہیں، وہ اس کی تلاوت کرتا ہے محض اس خیال سے کہ اس طرح اس پر برکات سماوی کا نزول ہوگا۔ جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو مریض کو اس کے ورقوں سے ہوا دے دیکر اچھا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے اور زعفران سے اس کی آیتیں چینی کی قاب پر لکھ کر پلائی جاتی ہیں۔ الغرض سوائے ان ظاہری و سطحی مراسم پرستش کے علاوہ کبھی ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ کلام مجید کی حقیقی عظمت اس کے مفہوم میں پنہاں ہے اور سچا مسلمان وہ ہے جو اس کی تعلیمات پر عمل کرنے والا ہے۔۔ پھر یہ "قاعدہ بغدادی" والی بلا اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ اختلاف نوعیت اور آگے بڑھتی ہے، یعنی جب کلام مجید ختم ہو جاتا ہے تو صرف و نحو کی کتابیں شروع کرائی جاتی ہیں اور اس عربی قواعد (گرام) سیکھنے کا مدعا زبان دانی نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ کہ فقہ و حدیث کی کتابیں پڑھ لینے میں اس سے مدد ملے۔ اس سلسلہ تعلیم میں اول تو تفسیر کی کتابیں بہت کم پڑھائی جاتی ہیں اور اگر پڑھائی بھی جاتی ہیں تو ساتھ ہی ساتھ یہ ذہنیت بھی پیدا کی جاتی ہے کہ جو کچھ اسلاف و اکابر لکھ گئے ہیں وہی برحق ہے اور اس سے انحراف کرنا یا خود اپنے ذہن و عقل سے کام لیکر سمجھنے کی کوشش کرنا گناہ ہے۔۔

علاوہ فقہ و حدیث کی کتابوں کے علوم حکمیہ کی جو بعض کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اتنی قدیم و فرسودہ ہوتی ہیں کہ ان کے پڑھ لینے کے بعد انسان وہی دو ہزار سال قبل کا انسان بنا رہتا ہے اور ساری عمر اسی طرح کے اعتقاد میں بسر کر دیتا ہے کہ زمین چپٹی ہے اور آسمان گردش کر رہا ہے۔ پھر لطف یہ کہ ان مسایل کو بھی وہ اتنی مذہبی اہمیت دیدیتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی مخالفت کرے تو وہ اسے مذہب کی مخالفت قرار دیتا ہے اور دائرۂ اسلام سے خارج ـــ الغرض خالص اسلامی تعلیم جس پر مسلمانوں کے بڑے بڑے تعلیمی اداروں میں لاکھوں روپیہ

صرف ہوا ہے یکسر مذہبی احتساب کے ماتحت اسی انداز کی نظر آتی ہے اور اب بھی ہر سال وہاں سے سیکڑوں نوجوان اسی کورانہ بلید ذہنیت سے نکل نکل کر قوم کی تباہی کے جراثیم پھیلا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے دماغ میں یہ بات مرتسم ہو چکی ہے کہ اس دنیا کی بہترین تعلیم وہی ہے جس سے صرف آخرت میں فایدہ اُٹھایا جا سکے اور سب سے بڑا عالم وہ ہے جو سب سے زیادہ مسایل مذہبی پر عبور رکھتا ہو۔

میں نے اگست کے ملاحظات میں ظاہر کیا تھا کہ علمار کرام نے ہماری بیماری کا علاج مذہب کو تجویز کیا لیکن افسوس ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے نہ صرف یہ غلطی کی کہ ذہنی ترقی کے لئے اعمال مذہب کو ضروری قرار دیا بلکہ تعلیم و تربیت کو بھی مذہبی احتساب سے متعلق کر کے انسان کو فرشتہ بنانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فرشتہ تو بن نہ سکا، لیکن احمق بنکر جنت کا مستحق ضرور ہو گیا۔

چونکہ مذہب و علم کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں ہے، اس لئے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ دور وسطی و آخر کے مسلمانوں نے اسکو محسوس نہیں کیا یقیناً محسوس کیا اور اس اعتقاد و یقین کے ساتھ کہ وہ علمی مسلّمات و حقایق کو صرف "زائیدۂ شیطان" سمجھکر مردود و مسترد نہیں کر سکتے، لیکن اس احساس کے بعد جو راہِ عمل انھوں نے اختیار کی وہ بالکل غلط تھی۔

ان کو چاہئے تھا کہ ذہنی تربیت و اصلاح کے لئے اکابر کے نقش قدم پر چلتے یعنی نئے پیدا ہونے والے تمام علوم و فنون پر مذہب سے بالکل علحدہ ہو کر غور کرتے اور ان کو اپنے یہاں رائج کرتے (جیسا کہ عہد بنی امیہ و بنی عباس میں ہوا تھا) لیکن انھوں نے یہ تو نہیں کیا بلکہ ان کی مخالفت شروع کی اور یہ کہکر کہ ان علوم کا مطالعہ مذہب کے خلاف ہے لوگوں کو ان کی طرف سے متنفر کرنا چاہا، اور اگر کوئی بات ایسی نظر آئی جس کے خلاف یہ حربہ کارگر نہ ہو سکتا تھا تو انھوں نے مذہبی کتابیں کیا بلکہ خود قرآن شریف کی آیتوں کو کھینچ تان کر پیش کرنا شروع کیا، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ایک طرف تو ان کا یہ دعویٰ کہ سب کچھ کلام مجید میں ہے باطل ہو جاتا اور دوسری طرف افراد قوم مذہبی اقتدار و گرفت سے آزاد ہو جاتے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مضحکہ انگیز کوششیں وہ ہیں جن کے ذریعہ سے فلکیات و حیاتیات کے بعض جدید مسایل کو قرآن پاک سے ثابت کیا جاتا ہے یہ درست ہے کہ کلام مجید میں سب کچھ ہے، لیکن اس "سب کچھ" کے معنے یہ نہیں ہیں کہ تمام علوم و فنون کے مسایل و مباحث بھی اس کے اندر پائے جاتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ کلام مجید کی عام تعلیم ایسی ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو انسان سب کچھ حاصل کر سکتا ہے دنیا کے تمام علوم و فنون کا ماہر ہو سکتا ہے اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ہر ممکن ترقی کر سکتا ہے۔

انسانی ترقی و فلاح کا اصل راز صرف یہ ہے کہ اس کے قوائے ذہنیہ کو پوری طرح کام کرنے کا موقعہ دیا جائے اور وہ کسی امر کے تسلیم کرنے پر صرف اس لئے مجبور نہ کیا جائے کہ اس سے قبل اکابر و اسلاف ایسا کہتے تھے۔ ایک قوم کے لئے اس سے زیادہ مہلک چیز کوئی نہیں کہ اس کے بچوں میں ابتدا ہی سے کورانہ تقلید کی عادت ڈالدی جائے اور اس جرم کا سب سے بڑا مرتکب ہر قوم اور زمانہ میں مذہبی علماء کا گروہ رہا ہے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ لوگ دنیا کے کسی مسئلہ پر حدودِ مذہب سے

علٰحدہ ہو کر غور کریں - پھر اگر اس سے مقصود واقعی کوئی مذہبی خدمت ہو تو بھی غنیمت ہے، لیکن وہاں نہ کوئی قدوسیت ہے نہ للّٰہیت بلکہ صرف یہ غرض کہ ان کی مرکزیت بدستور قایم رہے اور ان کا وہ اقتدار جس کی بدولت اُن کی بہت سی دنیادی خواہشیں جایز و ناجایز طور پر پوری ہوتی رہتی ہیں مٹنے نہ پائے - چنانچہ اس وقت ہمارے مذہبی قایدین کو سب سے بڑا صدمہ یہی ہے کہ بیدینی والحاد کا احاطہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے اور ان کی وہ عزت باقی نہیں رہی جو اس سے قبل ان کو حاصل تھی۔ اس کا سبب وہ مذہبی اُصول کی عدم پابندی بتاتے ہیں - یہ بالکل صحیح ہے لیکن کیا کبھی انھوں نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ مذہب کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہونے کا سبب کیا ہے ؟ -

انسان فطرتاً اطمینان نفس چاہتا ہے اور اطمینان نفس نام ہے ذہن وعقل کے اطمینان کا، پھر اس میں کلام نہیں کہ ہمارے علماء نے حتے المقدور اس کی بہت کوشش کی کہ مسلمان روایتی مذہب ہی پر قانع رہنا سیکھیں اور ان کے ذہن کو اس سے آگے کچھ اور سوچنے کا موقعہ نہ دیا جائے، لیکن روشنی کو آپ لاکھ روکئے، کسی نہ کسی طرح اسکا احساس ہو ہی جاتا ہے اور یہی وہ چیز تھی جس نے آخر کار ملک کے نوجوانوں میں مذہب کی طرف سے بے اطمینانی پیدا کردی اور اب ہر چہار طرف سے یہی آواز بلند ہو رہی ہے کہ یا تو مذہب کو عقل کی سطح تک لے آیا جائے یا پھر یہ نہ کہا جائے کہ مذہب عقل سلیم کے معیار پر بھی پورا اُترتا ہے -

الغرض جس چیز کو الحاد و بیدینی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ اصل میں صرف بے اعتمادی و بے اعتباری ہے جو تعلیمات مذہب کی طرف سے پیدا ہوگئی ہے اور اس کے دور کرنے کی صورت اب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مذہب کے زاویۂ نگاہ کو زیادہ وسیع کر دیا جائے، اور اُسے اس دنیا کے لئے مفید و کار آمد چیز سمجھ کر اس کی تبلیغ کیجائے -

ابھی چند دن کی بات ہے کہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے بعض کارکنوں اور ان کے ساتھ ہی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین مرحوم کے خلاف ۴۰، ۵۰ علماء نے کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا جسوقت مولانا حسین احمد صاحب دیوبندی وہاں پہونچے تو فتوائے کفر دکھا کر ان سے بھی اس کی توثیق چاہی گئی - مولانا ممدوح نے قبل صدور تکفیر چند استفسارات مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں سے کئے اور جب ان کی حسب خواہش و اعتقاد جوابات موصول ہو گئے تو وہ تکفیر سے باز رہے اور فتوائے کفر پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا -

جسوقت میں نے مولانا موصوف کے ان سوالات کو دیکھا تو حیران رہگیا کہ مسلمان ہونا کیا واقعی اتنا مشکل کام ہے اور کیا حقیقتاً بغیر آزادی ذہن و فکر کو خیرباد کہے ہوئے کوئی شخص مسلمان نہیں بن سکتا - مجھے کارکنان مدرسۃ الاصلاح کے اسلام و ایمان پر رائے زنی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، لیکن اس استفسار و جواب کو دیکھ کر کم از کم مجھے اپنے کافر ہونے کا ضرور یقین ہوگیا کیونکہ مولانا موصوف کے کسی ایک سوال کا جواب بھی میری طرف سے وہ نہیں ہو سکتا تھا جو وہ سننا چاہتے تھے --- دنیا میں اسوقت تک جتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں انھوں نے سب سے پہلے وقت و زمانہ کے اقتضاء کا

لحاظ رکھا ہے، چنانچہ خود جناب رسالتمآب نے بہت سی ایسی اصلاحوں کی تکمیل میں عجلت سے کام نہیں لیا جن کو یقیناً فوراً رائج ہوجانا چاہئے تھا، لیکن وقت و ماحول کا اقتضا تدریج چاہتا تھا۔۔ مذہب کا مقصود اخلاق اور حیات اجتماعی کی اصلاح ہے اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی شخص نفسیاتی امور سے واقف نہ ہو۔ پھر ایک نفسیات داں کا فرض اقتضاء زمانہ سے جنگ کرنا نہیں ہے بلکہ وقت و ماحول کے ان اثرات کا مطالعہ کرنا ہے جن سے نوع انسانی کی ذہنیت متاثر ہو رہی ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر فکر انسانی میں سلامت روی پیدا کرنا ہے۔۔ وہ زمانہ گزر گیا ہے جب یوروپ کے باشندے کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ ایشیا میں کوئی انسان بستا ہے یا نہیں اور ایشیا کا رہنے والا اس سے بے خبر تھا کہ یوروپ انسانوں کی بستی ہے یا جانوروں کی۔ اُسوقت چونکہ تمام علوم انسانی محدود تھے اس لئے مذاہب کی تعلیم بھی محدود تھی اور مخصوص جماعتوں کے علاوہ تمام نوع انسانی کے امیال و عواطف پر حاوی ہونے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ آج علم و تمدن کی ترقی نے کرۂ ارض کے تمام باشندوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے اور ہر ملک دوسرے ملک کی تہذیب و معاشرت اور اس کے خیال سے متاثر ہو رہا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ یوروپ کا انسان تو واقعی ہوا میں اُڑتا پھرے اور آپ ایشیا کے انسان کو یہ سمجھائیں کہ یہ صرف فریب نظر ہے۔ اگر ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مقابلہ میں اسوقت "تخلیق آدم" کے مذہبی نظریہ کو لوگ ماننے کے لئے طیار نہیں ہیں تو کوئی ضرورت نہیں کہ آپ اسے جزو مذہب قرار دیکر "ارتقائیین" کو کافر کے لقب سے یاد کریں۔ اگر مادی و محسوس بہشت و دوزخ تسلیم کرنے کے بجائے میلان کسی کا یہ ہے کہ انھیں ذہنی و کیفیاتی چیز مانے تو مذہب کا کیا اس میں نقصان ہے اور خدا کی خدائی کو اس سے کیا صدمہ پہونچتا ہے۔ اگر کوئی شخص بقاء روح یا حیات بعد الموت کو تسلیم نہیں کرتا تو آپ کیوں اسکے دشمن ہوجائیں، اور خدا اس سے کیوں ناراض ہو، جبکہ عظمت خداوندی میں اس اعتقاد سے بھی کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔۔ اسوقت اہل مذاہب کو جن مشکلات کا سامنا ہے ان کا تعلق حقایق و مسلمات سے ہے اور اب ان کے لئے چارہ کار سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ یا تو وہ مذہب کی بنیاد صرف کسی مخصوص کلچر میں قایم کریں یا پھر اپنے تقشف میں اتنی کمی کر دیں کہ جو ان کا ہمخیال نہیں ہے اسے اپنی جماعت سے علحدہ نہ قرار دیں۔

اب ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر پھر غور کیجئے کہ آیا مسلمانوں کے وہ مدارس جہاں کا نظام درس و تدریس اہل مذہب کے زیر اثر قایم ہے اُس ذہنی بے چینی کو دور کر سکتے ہیں جو موجودہ علوم و فنون نے پیدا کر رکھی ہے اور کیا اسوقت بھی ان کا قدیم و فرسودہ نصاب جو اس دنیا کے لئے بالکل بیکار ہے، قوم کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔۔ اسوقت ہم کو ایسی تعلیم کی ضرورت نہیں جو روایتی عقاید سے تعلق رکھتی ہو، بلکہ ضرورت ہے ایسی تعلیم کی جو ہمارے قواء عمل کو برانگیختہ کرے اور فکر و ذہن کی بیداری و آزادی کو تقویت پہونچائے۔۔ وہ زمانہ جب درستی اخلاق کے لئے نکیرین کا گرز، قبر کا پسلیاں توڑ دینے والا فشار، اور جہنم کا شعلۂ سیاہ درکار ہوتا تھا، گزر گیا ہے۔ اب دنیا، اخلاق کی اہمیت کو خالص اخلاق کے نقطۂ نظر سے اچھی طرح سمجھنے لگی ہے اور بغیر اندیشۂ عذاب و تمنائے ثواب اسکی ضرورت کو محسوس کر رہی ہے، اس لئے مذاہب عالم جو صرف درستی اخلاق

کا درس دینے آئے تھے اب معزول ہو چکے ہیں اور ان کے لئے کوئی جگہ اس حرکت و عمل کی دنیا میں باقی نہیں رہی۔ البتہ اگر وہ اپنا نقطۂ نظر بدلکر ہماری دنیا وی حیات کی گتھیاں سلجھانا اپنا نصب العین قرار دے لیں، تو بیشک وہ اب بھی زندہ رہ سکتے ہیں اور نوع انسانی کو ان سے بیزاری کی کوئی وجہ نہیں ــــ مذاہب عالم میں سب سے زیادہ صلاحیت اس امر کی مذہب اسلام میں پائی جاتی ہے، کیونکہ اسلام کوئی خیالی یا اعتقادی چیز نہیں ہے بلکہ حرکت و عمل سے اس کا تعلق ہے۔ وہ اسی دنیا کی چیز ہے اور اسی دنیا کی اصلاح اس کا مقصد اعظم ہے، وہ دوسری دنیا کے خوشنما خواب دکھا کر یہاں کی زندگی کو ناکارہ نہیں بناتا، اس کا اصرار یہ نہیں ہے کہ تم آنکھ بند کر کے کسی راستہ کو اختیار کر لو، وہ دین کے باب میں جبر و اکراہ کا سخت مخالف ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسوقت مذہب اسلام ہی سب سے زیادہ متشدد نظر آتا ہے اور اسی کے حامی و علمبردار ذرا ذرا سی بات میں اپنے افراد کو اپنی جماعت سے علیحدہ کرنے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انھوں نے مذہب اسلام کی صحیح روح کو نہیں سمجھا اور بجائے قرآن پاک کے انھوں نے ایسے لٹریچر سے تمسک کیا ہے جو یکسر ظنی و غیر یقینی ہے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ مدارس جن کا مقصود ہی اس نوع کے لٹریچر کی تعلیم ہے، کیا مفید ہو سکتے ہیں اور قوم کب تک ان کے اس ذہنی غلامی پھیلانے والی کارگاہ کو گوارا کر سکتی ہے۔

اسوقت مسلمانوں کی بڑی سی بڑی مذہبی درسگاہ کو جا کر آپ دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ اس کے گوشہ گوشہ سے نکبت و ذلت برس رہی ہے اور ولولہ و نشاط جو قومی ترقی کی جان ہے وہاں کے اساتذہ و طلبہ دونوں میں مفقود ہے۔ مسلمانوں کی ۸ کروڑ کی آبادی میں کسی ایک ایسی مذہبی درسگاہ کا بھی نہ پایا جانا جو اپنا مخصوص سرمایہ رکھتی ہو، کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ قوم کو ان درسگاہوں کی ضرورت نہیں ہے اور ان کو آج نہیں تو کل مٹ جانا ہے۔

آئندہ صحبت میں غیر مذہبی درسگاہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بتاؤں گا کہ وہ عام تعلیم جس کا ذکر میں نے اگست کے نگار میں کیا ہے کیا معنی رکھتی ہے اور اس کے حصول کی کیا تدابیر ہم کو اختیار کرنا چاہئے۔

میری حاضری علیگڈھ میں

زبان اردو کی ترقی اور موجودہ اردو ہندی نزاع کے سلسلہ میں اقدام و دفاع کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے علیگڈھ میں ایک جلسہ طلب کیا ہے جس میں ملک کے مخصوص افراد کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ میں بھی ۲۳ر اکتوبر کی شام یا ۲۴ر کی صبح تک علیگڈھ پہونچ جاؤں گا اور وہاں سے ۲۶ر کو واپس آؤں گا۔ اس اعلان سے مقصود صرف ان احباب علی گڈھ کو مطلع کرنا ہے جن سے ملنے کے لئے میں بیتاب ہوں۔ وہ ہوں یا نہ ہوں ــــ میری جائے قیام کا پتہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی سے معلوم ہو سکے گا۔

سید سلیمان ندوی کی فنی و تاریخی غلطیاں

حیات مالک ہیں

یہ مقالہ ہمارے فاضل دوست مولوی عبدالمالک صاحب آروی کی تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہے جس میں سید سلیمان ندوی کی "حیات امام مالک" پر تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ ان کی یہ تالیف کس قدر اسقام و اغلاط سے لبریز ہے۔

ادارۂ دار المصنفین ملک کا نہایت مشہور ادارہ تصنیف و تالیف ہے۔ جو نہ صرف ارکان دار المصنفین بلکہ ملک کے دوسرے اہل قلم کی تصانیف بھی شائع کرتا رہتا ہے اور حقیقت سے انکار ہوگا اگر اس کی بعض "شائعات" کی خوبی کا اعتراف نہ کیا جائے۔

دار المصنفین کی مطبوعات (مولانا شبلی کی تصانیف کو چھوڑ کر) دو قابل ذکر حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ ایک حصہ ان تالیفات کا ہے جو شعر و ادب سے متعلق ہے اور دوسرے حصہ میں وہ کتابیں ہیں جو تاریخ "مذہبیات" سے تعلق رکھتی ہیں، اول الذکر حصہ ہر چند بہت کم ہے تاہم جتنا بھی ہے مفید و کارآمد کتابوں پر مشتمل ہے۔ لیکن دوسرا حصہ چونکہ یکسر مقلدانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے اس لئے سوائے ایک ایسے شخص کے جو پہلے ہی سے راسخ العقیدہ مسلمان ہو کوئی اور اس سے استفادہ نہیں کر سکتا اور نہ ان کو پڑھنے کے بعد اسلام کے متعلق اپنی رائے بدل سکتا ہے۔

ہر چند دار المصنفین کو یہ فخر کبھی حاصل نہیں ہوا کہ اپنے ادارہ میں جسے "صومعۂ تقدس و پارسائی" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، منکرین آزاد خیال کو بھی باریابی کا موقعہ دیتا اور اس طرح وہ بخاری و مسلم کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر محض خالص علمی و تحقیقی زاویۂ نگاہ سے اسلام و تعلیمات اسلام کو پیش کرنے کے قابل ہوتا۔ لیکن دنیا نے اس سے ہمیشہ یہی توقع قائم کی اور ہمیشہ اسے مایوس ہونا پڑا یہاں تک اس کا سب سے بڑا کارنامہ "سیرۃ النبی" سب سے زیادہ مایوس کن ہے۔ "حیات امام مالک" بھی اسی شعبۂ تصنیف و تالیف سے متعلق ہے اور چونکہ وہ اس ادارہ

کے "مسولینی" کا نتیجۂ فکر و تحقیق ہے۔ اس لئے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس تالیف کی اہمیت کا انحصار اگر صرف اس امر پر ہے کہ اس میں امام مالک کا ذکر ہے اور ادارۂ دار المصنفین کے "پیر خانقاہ" نے کیا ہے تو ان دونوں باتوں سے انکار ممکن نہیں، لیکن اگر "مآل" کو سامنے رکھ کر اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہے تو مولوی عبد المالک صاحب کے اس مقالہ کو پڑھیے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ تالیف مایوس کن نہیں ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے جزئیات سے کام لیکر علٰحدہ علٰحدہ تمام غلطیوں کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ اصولاً اُن کی نوعیت کا اظہار کر کے جابجا ان کی طرف اشارے کر دئے ہیں، کیونکہ بصورت دیگر یہ مقالہ بہت زیادہ طویل ہو جاتا۔

ہمارے قابل دوست نے اس مضمون میں جس دقت نگاہی اور تاریخی نکتہ سنجی سے کام لیا ہے اور سید سلیمان صاحب ندوی کے چھوڑے ہوئے خلاؤں کو جس محنت و کاوش سے پُر کیا ہے اس کی داد ہر صاحبِ علم و نظر دیگا۔

اگر سید صاحب اس کے جواب میں کچھ ارشاد فرمانا پسند کریں اور نگار میں اس کی اشاعت کی ذلت کو برداشت کر سکیں تو نگار کے صفحات حاضر ہیں۔

نیاز

"اہل بہار کی خدمتِ حدیث" کے عنوان سے میرا ایک مقالہ "جامعہ" (دہلی) بابت اکتوبر ۴۲ء میں شائع ہوا تھا اس مضمون کی ترتیب کے وقت تک "حیات مالک" مصنفہ مولٰنا سید سلیمان ندوی میری نظروں سے نہیں گزری تھی اس لئے اس کتاب کے متعلق کوئی تبصرہ نہیں لکھا گیا صرف یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ مولانائے ممدوح نے قدیم کتابوں کی تالیف میں علامہ ذہبی سے کام لیا ہوگا۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے رفیق ظہیر الدین حیدر صاحب نے اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے عنایت کیا۔ مجھے توقع تھی کہ شاہ عز الدین (پھلواروی) کی "سیرت امام احمد بن حنبل" کی طرح اس کو پڑھ کر آنکھیں پُر نم ہو جائیں گی، مصنف نے واقعات و حالات پوری کاوش سے جمع کئے ہوں گے معلومات میں اضافہ ہوگا لیکن ادب و انشا کی خامیاں، تحقیق و جستجو کا فقدان، اسقام و نقائص کی فراوانی، تصحیفات و اغلاط کی کثرت دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔

آپ ساری "حیات مالک" پڑھ جائیے، نہ تو کہیں آپ کو حضرت امام مالک کی اولاد کا حال معلوم ہوگا نہ ان کے خاندان کے صحیح حالات کا پتہ چلیگا، حالانکہ آپ کے صاحبزادے یحییٰ و محمد رُواۃِ حدیث میں گزرے ہیں اور آپ کی صاحبزادی بڑی عالمہ فاضلہ تھیں اس کے علاوہ خاندانی حالات میں بنی تیم کا تذکرہ ناگزیر تھا، لیکن اس کے متعلق بھی ایک لفظ درج نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مصنف نے مادری سلسلہ کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، حالانکہ ایک مورخ کا فرض تھا کہ واقعات کا استقصاء کرتے اور روایات متداولہ کو نقل کرکے اپنی رائے

ظاہر کر دیتا۔ اسی طرح بہت سے لوگوں کا نام غلط درج ہے۔ موطا کے بہت سے شروح اور شارحین کے اسماء (تصحیف کے باعث جس طرح کشف الظنون اور تزئین الممالک میں غلط درج ہیں) اُن کو اسی طرح نقل کر دیا گیا ہے۔ موطا کے بہت سے معتبر اور اہم شروح کا تذکرہ نہیں کیا گیا اس وجہ سے فہرست بالکل نامکمل رہ گئی یہ تو عام طور پر اغلاط و اسقام کا ایک مختصر خاکہ ہے سب سے بڑا نقص جو اس کتاب میں نظر آتا ہے وہ یہ کہ فقہ مالکی کے اسباب عروج و ارتقاء سے کوئی بحث نہیں کی گئی، اور نہ یہ بتایا گیا کہ مصر و طرابلس، تونس و مراکش الجزایر و اندلس ہی میں زیادہ تر مذہب مالکی کا رواج کیوں ہوا پھر اسی کے ساتھ مالکیہ کے اکابر رجال سحنون بنو حماد وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں حالانکہ امام مالک اور فقہ مالکی کے تذکرہ نگار کے لئے ان لوگوں کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔

اس سلسلہ میں بعض ایسی کتابوں کے اجمالی حالات بیان کئے جاتے ہیں جو اس موضوع پر بہت اہمیت رکھتی ہیں لیکن سید صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔

الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب —— اس کا مصنف قاضی القضاۃ ابراہیم ابن علی بن محمد بن فرحون الیعمری المدنی المالکی ہے، امام مالک کی مفصل زندگی، فقہ مالکی کی خصوصیات، موطا کے خصایص و شروح فقہائے مالکیہ کے سوانح حیات کے متعلق یہ کتاب نہایت اہم اور معتبر ہے اور اکابر علماء نے بھی امام مالک کی زندگی، ان کے اقوال، ان کی مجالس، اور ان کے فضایل میں بہت سی کتابیں مثلاً محمد بن حارث بن اسد الخشنی[1] (متوفی سنہ ۳۶۱ھ یا ۳۶۴ھ) کی ایک کتاب "طبقات فقہائے مالکیہ" ہے۔ اسی طرح ابوبکر محمد ابن احمد معروف بہ ابن خلال (متوفی سنہ ۳۲۲ھ) نے چالیس جز میں امام مالک کے اقوال کا انتخاب جمع کیا، محمد[2] بن ابراہیم بن عبدوس (متوفی سنہ ۲۶۰ھ یا ۲۶۱ھ) نے فضایل اصحاب مالکؒ "مجالس مالک" کے نام سے چار حصوں میں ایک کتاب لکھی۔

---

[1] الخشنی نے قیروان میں فقہ کی تعلیم حاصل کی افریقیہ کے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا اس کے بعد نو عمری میں اندلس میں داخل ہوا، اور قیروان میں سکونت اختیار کی —— [2] ابن عبدوس مالکیہ میں وہ مشہور ہستی تھے کہ علماء کا فیصلہ ہے کہ ایک عہد میں چار ایسے مالکی فقیہوں کا اجتماع ہوا، کہ پھر دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی، ان میں ابن عبدالحکم اور ابن مواز شہر کے رہنے والے تھے، اور ابن عبدوس اور ابن سحنون دیہات کی پیداوار تھے، ابن عبدوس امام سحنون کے اصحاب میں بہت برگزیدہ، عابد زاہد اور اپنے زمانہ کے امام تھے، وضع اور اخلاق میں سب سے زیادہ امام سحنون سے مشابہ تھے آپ کو عجمی الاصل اور قریش کا غلام بتلایا جاتا ہے احمد بن زیاد نے یہاں تک کہدیا کہ میرا گمان ہے کہ ابن عبدوس کے مقابل تابعین میں فضل اور زہد کے اعتبار سے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

اسی طرح سیوطی شافعی اور امام محمد حنفی نے بھی موطا کی شرحیں لکھیں اور امام مالک کے مناقب بیان کئے، لیکن ابن فرحون کی "الدیباج" میں ایسے تاریخی مواد ملتے ہیں کہ ایک مرتبہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد دوسری کتابوں کی ورق گردانی سے انسان بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ابن فرحون کون تھا اس نے کب انتقال کیا اس کا وطن کہاں تھا اور اس کے خاندان کی کیا حالت تھی، اس کا جواب ابوالعباس احمد معروف بہ بابا التنبکتی کی کتاب "نیل الابتہاج" سے پوری طرح مل جاتا ہے، بابا التنبکتی نے اپنی کتاب ابن فرحون ہی کے تذکرہ سے شروع کی ہے گویا "نیل الابتہاج" ابن فرحون کی "الدیباج المذہب" کا تتمہ ہے "دیباج" کا پیش نظر نسخہ ۱۳۲۹ھ میں مطبع السعادہ مصر میں چھپا تھا کتاب کے آخر صفحہ میں مذکور ہے کہ ابن فرحون نے کہا کہ اس کتاب کی تالیف سے بماہ شعبان ۷۶۱ھ میں فراغت حاصل ہوئی، لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا چونکہ ابن فرحون نے اسی کتاب کے اندر اپنے چچا عبداللہ بن محمد کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۷۶۹ھ میں ان کا انتقال ہوا، بہرحال یہ مسلم ہے کہ اواخر آٹھویں صدی میں مصنف نے یہ کتاب لکھی، کیونکہ ابن فرحون نے بابا تنبکتی کی روایت کے مطابق ۷۹۹ھ میں وفات کی۔

ابن فرحون کا نسب یہ ہے، ابراہیم بن علی بن محمد بن ابوالقاسم، بن محمد بن فرحون یعمری، ان کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے بہت ہی ممتاز تھا، باپ دادا، چچا سبھی علامہ اجل تھے، چنانچہ ان کے ایک چچا عبداللہ ابن محمد (متوفی ۷۶۹ھ) بہت بڑے عالم، فقیہہ اور حدیث میں علوئے سند کے لئے اپنے زمانہ میں ممتاز تھے، یہ پچاس سال تک حرم نبوی میں درس و افتاء میں مشغول رہے، چوبیس سال تک منصب قضا پر فائز رہے عابد زاہد تھے، رات کے آخری تہائی حصہ میں ہمیشہ بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہتے، انھوں نے نحو، لغات ادب، حدیث وغیرہ مختلف فنون پر بہت سی کتابیں لکھیں، جن میں موطا کی دو شرحیں ہیں اس کی تفصیل آگے آتی ہے، ابتداءً انھوں نے فقہ اور عربی کی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی جو بہت بڑے علامہ، فقیہہ، مفسر اور محدث تھے، الغرض ابراہیم ابن علی ابن فرحون ایک ایسے خاندان کا فرد تھا جو صدیوں سے علم و ادب کے لئے امتیاز رکھتا تھا ابن فرحون (مصنف دیباج) مدینہ میں پیدا ہوئے، بابا التنبکتی فرماتے ہیں:۔

فتدرب بعمہ ابی محمد بن فرحون عالماً بالفقہ والنحو والاصول والفرائض والوثایق وعلم القضاء وعالما بالرجال وطبقاتہم مشارکا فی الاسانید واسع العلم فصیح القلم ذا بیان کریم الاخلاق حلو المنظر بعیداً من التصنع والریاء من ارق اہل زمانہ

آپ نے اپنے چچا ابو محمد بن فرحون سے تعلیم حاصل کی جو فقہ، نحو، اصول، فرائض، وثایق اور قضا کے ماہر تھے اور رجال اور انکے طبقات کا مع اسناد علم رکھتے تھے آپ کا علم وسیع تھا اور آپ کے قلم میں زور بیان اور فصاحت تھی، آپ کا کردار بلند اور چہرہ حسین تھا، بناوٹ و نمائش سے دور تھے

طبعاً والطفہم عبارۃ کثیر الاوراد والتلاوۃ یحی آخر اللیل۔

اپنے زمانہ کے بہت دردمند انسان تھے، لطف و مہر سے بولتے کثرت سے ورد و وظیفہ پڑھتے اور آخر شب میں بیدار رہتے۔

مصنف "دیباج" خوبصورت چہرہ، میانہ قامت تھے، عمامہ کے اوپر طیلسان (چادر) اوڑھا کرتے، کئی مرتبہ مصر کا سفر کیا، ۷۹۲ھ میں قدس اور دمشق ہیں آئے، ۷۹۳ھ میں مدینہ منورہ کے قاضی مقرر ہوئے انھیں کی بدولت مالکی مذہب کو انحطاط کے بعد عروج ہوا، آپ کے داہنے طرف فالج گرا اور اسی سے وفات کی۔

اپنے والد، چچا، اور شیخ ابو عبد اللہ المطری سے موطا، صحیحین، سنن ابی داؤد، اور ابن ماجہ پڑھی، مدینۃ النبی اور ممالک اسلامیہ کے مشاہیر محدثین و علما سے علم حاصل کیا آپ نے بہتیری کتابیں لکھیں ان میں "مختصر ابن حاجب" کی شرح مسمیٰ "تسہیل المہمات فی شرح جامع الامہات" آٹھ جلدوں میں ہے، دوسری کتاب "تبصرۃ الحکام فی اصول الاقضیہ ومنہاج الاحکام" ہے اس کے متعلق بابا التنبکتی فرماتے ہیں:۔

"لم یسبق لمثلہ وفیہا من القواید مالایخفی" (اسکی مثال پہلے نہیں ملتی، اور اس میں ایسے فواید ہیں جو پوشیدہ نہیں) تیسری کتاب "الدیباج الذہب" ہے جس میں چھ سو سے زیادہ مالکی علما اور فقہا کے حالات ہیں طب میں مفردات ابن بیطار سے ایک کتاب "المنتخب" لکھی، بابا تنبکتی لکھتے ہیں، کہ ابن فرحون کے نسب کے متعلق میرے دادا احمد بن عمر التنبکتی نے ایک تحریر لکھی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ "یعمری" منسوب ہے یعمر بن مالک بن ہیثم کی طرف جو ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان کی اولاد میں ہیں آپ کو "اُیانی" اور "جیانی" بھی کہا جاتا ہے چونکہ افریقیہ کے ان بلاد میں آپ کا خاندان آباد تھا، مگر آپ کے چچا ابو محمد ابن فرحون اور خود آپ مدینہ میں پیدا ہوئے اس لئے "مدنی" مشہور ہیں آپ کے چچا ابو محمد ابن فرحون نے مدینۃ النبی کی تاریخ لکھی ہے اس میں آپ کی ماں اور دادی دونوں کو ہاشمیہ (شریفہ) لکھا ہے۔

نیل الابتہاج بتطریز الدیباج ـــ اس کے مصنف ابو العباس احمد بن احمد بن احمد بن عمر بن محمد اقیت عرف بابا التنبکتی ہیں مصنف کا بیان ہے کہ یہ کتاب ۱۰۰۵ھ میں بمقام مراکش لکھی گئی، ابن فرحون کی "الدیباج المذہب" میں آٹھویں صدی تک کے فقہائے مالکی کے حالات مرقوم ہیں، بابا تنبکتی کی "نیل الابتہاج" گویا اسی کا تکملہ ہے اس میں دو سو برس کے مزید حالات ملتے ہیں۔ بعض فقہا کے حالات میں ابن فرحون کی تحقیقات پر اضافے کئے گئے ہیں چنانچہ بابا تنبکتی فرماتے ہیں:۔

"وزدت فی بعض تراجم من ذکرہ ماترک من اوصاف المشکورہ"۔ (اور میں نے بعض اشخاص کی سوانح حیات میں ان قابل تعریف باتوں کا اضافہ کر دیا جن کو انھوں (ابن فرحون) نے اپنے بیان میں نظر انداز کر دیا تھا۔

باباتنبکتی کا خاندان بھی علم و فضل، شہرت و عزت کے اعتبار سے ابن فرحون سے کم نہ تھا۔ ان کے والد دادا، چچا، بھائی اور خاندان کے دوسرے افراد محدثین عظام اور فقہائے جلیل کے طبقات میں شمار کئے جاتے ہیں۔

آپ کے دادا تین بھائی تھے احمد بن عمر، محمود، عبداللہ۔ یہ تینوں اپنے زمانہ کے مشاہیر رجال میں گزرے ہیں احمد بن عمر باباتنبکتی کے دادا ہیں یہ بہت بڑے عالم، پرہیزگار اور متبع سنت تھے، آں حضرت صلعم کی محبت میں سرشار رہا کرتے، اور آپ کی مدح میں قصاید پڑھتے، آپ نے اپنے نانا سے جو تنبکت[1] کے قاضی تھے علم حاصل کیا اپنے ماموں سے جن کا نام مختار تھا اور فقہ میں امتیازی شان رکھتے تھے نحو کی تحصیل کی سنہ ۸۹ھ

---

[1] سنہ ۱۸۶۲ء میں لندن کے اندر بمقام واٹرلو پلیس "رایل جغرافی سوسائٹی" کے ایک جلسہ میں سوسائٹی کے صدر سر فرانسس ایم نے کہا کہ ڈاکٹر فرگوسن انگریز قوم کی شان میں اپنی ایک سعی سے اضافہ کرنے والے ہیں اگر ان کی کوشش کامیاب ہو گئی تو افریقہ کا نقشہ مکمل ہو جائیگا۔ ڈاکٹر فرگوسن انگریزی بحری جہاز کے ایک شجاع کپتان کا لڑکا تھا وہ مشہور سیاحوں منگو پارک، بروس، کیلی، لیو بلینٹ وغیرہ کی طرح سیاحانہ کارنامہ پیش کرنا چاہتا تھا وہ ہندوستان میں بھی آیا تھا کلکتہ سے سورت پہونچا، وہاں سے آسٹریلیا گیا ۱۸۴۵ء میں کپتان اسٹرٹ کے ساتھ بحر اخضر کے انکشاف کے لئے روانہ ہو گیا جس کے متعلق خیال ہے کہ ہالینڈ کے داخلی حصہ میں واقع ہے ۔۔۔ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۵ء تک وہ تبت کے مغرب میں سفر کرتا رہا ان سیاحتوں کے زمانہ میں وہ اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" کا نامہ نگار بھی تھا۔ اب اس نے افریقہ کی سیاحت کے لئے کمر چست کی اس کا یہی سفرنامہ بیلفری Three weeks in a bel کے نام سے ہمارے پیش نظر ہے اس میں اس نے تفصیل کے ساتھ تنبکت (Timbuctoo) کا تذکرہ کیا ہے وہ لکھتا ہے "سفید بالو کے لق و دق بیابان میں مثلث شکل کا یہ شہر واقع ہے ارد گرد میں سبزی بہت کم ہے، یہاں جو کچھ ہے وہ پست قد اور ٹھٹھری ہوئی جھاڑیاں گلیاں تنگ ہیں، ایک منزلہ مکان ہیں، جو دھوپ میں پکی ہوئی اینٹ سے بنے ہیں یا جھلاس اور پھونس سے، پہلی قسم کا مکان مخروطی ہے، اور دوسری قسم کا مربع، چبوتروں پر باشندے بیٹھے تھے، جو زرق برق لباس پہنے تھے، اور ہاتھ میں نیزہ یا بندوق لئے ہوئے تھے، دن کے اوقات میں کوئی عورت نظر نہیں آئی۔۔۔ یوں تو بہت سی مسجدیں ہیں لیکن ان میں تین پر شکوہ اور بلند ہیں یہ شہر اب اپنی قدیم شوکت سے دور جا پڑا ہے، اس مثلث کے سرے پر "سنکار مسجد" واقع ہے۔ سین گانگو محلہ کے نزدیک سیدی یحیٰی کی مسجد ہے اور چند دو منزلہ مکانات ہیں یہاں قصر و کوشک یا مقبرہ وغیرہ کی تلاش فضول ہے، شیخ ایک معمولی تاجر ہے، اور اس کا شاہی مسکن اسکی دوکان ہے ۱۸۲۶ء میں (Foullannes) قوم نے اس شہر کو ویران کر ڈالا، اسوقت یہ شہر ایک تہائی اور بڑا تھا۔ گیارھویں صدی سے تنبکت پر عام طور سے طمع کی نگاہیں پڑتی رہی ہیں مختلف اقوام Maraciana, Sonrayen, Touaregs اور Foullanns نے اسپر دخل و اقتدار رکھا۔ اور تہذیب کا یہ عظیم الشان گہوارہ جہاں سولہویں صدی میں احمد بابا سودانی ۱۶۰۰ مخطوطات کی ایک لائبریری رکھتے تھے، اب ایشیائے وسطی کی تجارت کی صرف منڈی ہے۔" (ص ۲۳۴)

میں حج کیا اور امام سیوطی اور خالد ازہری شارح توضیح سے ملاقات کی پھر اپنے وطن کی طرف لوٹ گئے آپ کے بھائی فقیہہ محمود اور بہت سے لوگوں نے آپ سے تحصیل علم کی، سنہ ۹۴۲ھ میں انتقال فرمایا بابا تنبکتی نے آپ کی کرامت کے سلسلہ میں ایک نہایت عجیب واقعہ لکھا ہے، وہ یہ کہ آپ مدینہ منورہ پہونچے مزار مبارک کی زیارت کے لئے حجرہ کے اندر جانا چاہا لیکن لوگوں نے روکا مجبوراً دروازہ پر بیٹھ گئے اور آپ کی تعریف کرنے لگے کہ یکایک بلا کسی سبب کے دروازہ کھل گیا آپ اندر تشریف لے گئے، بابا تنبکتی کہتے ہیں یہ قصہ میں نے اپنے والد سے سنا اور تمام لوگوں میں یہ مشہور ہے میرے والد نے ایک دن مجھ سے بیان کیا کہ انھوں نے دادا مرحوم سے اس کے متعلق دریافت کیا تو وہ چپ رہ گئے کوئی جواب نہ دیا۔

محمود بن عمر (بابا تنبکتی کے دادا کے بھائی) الفقیہہ کے لقب سے مشہور ہیں یہ تنبکت کے قاضی تھے، اپنی علمی قابلیت، فقیہانہ اجتہادات، بزرگانہ صلاح و تقوی اور عالمانہ شان و وقار کے لئے مشرق و مغرب کے تمام ممالک میں مشہور تھے، بابا تنبکتی فرماتے ہیں:-

یہابہ السلاطین فمن دونہم دیذورونہ فی بیتہ فلا یقوم لہم ولا یلتفت الیہم۔	سلاطین اور انکے ماسوا آپ سے ہیبت زدہ تھے، وہ آپکے دولتکدہ پر زیارت کیلئے آتے آپ نہ توانکی تعظیم کیلئے کھڑے ہوتے نہ انکی طرف التفات کرتے۔

آپ سنہ ۹۰۴ھ تک منصب قضا پر فایز رہے، اور سختی سے احکام شرعیہ کا نفاذ کرتے تھے، حق کی پاسداری اور باطل شکنی میں آپ کی شہرت ایسی ہوئی کہ اس کی نظیر آپ کے زمانہ میں نہیں ملتی۔ حکم الٰہی کے سامنے کسی مخلوق کے طعن و ملامت کی پروا نہیں کرتے تھے، سنہ ۹۱۵ھ میں حج کیا اور ابراہیم مقدسی، شیخ زکریا، اور شیخ القلقشندی وغیرہ سے ملے سولہویں رمضان جمعہ کی رات سنہ ۹۵۵ھ میں انتقال کیا آپ کے تینوں صاحبزادے قاضی محمد، قاضی عاقب اور قاضی عمر آپ سے مستفید ہوئے۔ بابا تنبکتی کے والد احمد بن احمد بن عمر نے بھی آپ سے فیض علمی حاصل کیا محمود الفقیہہ کے پوتے احمد بن سعید (متوفی سنہ ۹۷۶ھ) بہت نامور ہوئے آپ نے مرتے دم تک مسند درس قائم رکھا حلقۂ درس میں لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا آپ کے دونوں بھائی محمد اور احمد بھی ہیں ان لوگوں نے آپ سے موطا، مدونہ اور مختصر خلیل وغیرہ پڑھی، بابا تنبکتی بھی بچپن میں آپ کے حلقہ درس میں شریک ہوئے تھے، محمود الفقیہہ کے ایک اور صاحبزادہ عبداللہ بن محمود کا تذکرہ نیل الابتہاج میں پایا جاتا ہے یہ بھی اپنے والد کی طرح بڑے فقیہہ تھے، بابا تنبکتی فرماتے ہیں:-

"کان فقیہا ساذجا مستحضر المسایل الفقہ" (آپ سادہ مزاج فقیہ تھے فقہی مسایل آپ کے پیش نظر رہتے) انھوں نے سنہ ۱۰۰۰ھ میں بمقام مراکش طاعون کے عارضہ سے وفات کی۔

عبداللہ بن عمر بن محمد اقیت (بابا تنبکتی کے دادا کے بھائی) بڑے زاہد اور فقیہ تھے، آپ کا حافظہ

بہت قوی تھا، شہر ولاتن میں درس دیتے تھے، ۹۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔

بابا تنبکتی کے والد احمد بن احمد بن عمر بھی اپنی خاندانی روایات کے مطابق محدث و فقیہ ہوئے، اصول و منطق میں ید طولیٰ حاصل کیا پہلے اپنے شہر کے امام اور چچا محمود بن عمر سے تحصیل علم کی، اس کے بعد ۹۵۶ھ میں مشرق کا سفر کیا حج و زیارت کی، علما کی ایک جماعت الناصر اللقانی شریف یوسف الارمیونی شاگرد امام سیوطی، جمال الدین ابن شیخ زکریا، شیخ تاجوری، اور الاجھوری اور اس طبقہ کے مشاہیر سے ملاقات کی اور ان سے استفادہ کیا مکہ اور مدینہ میں امین الدین المیمونی، ابن حجر مکی، ملائی، عبدالعزیز اللمطی، عبد المعطی السخاوی، عبدالقادر الفاکہانی وغیرہ سے فیض صحبت حاصل کیا آپ حدیث، ادب اور منطق کا بہت بلند ذوق رکھتے تھے چنانچہ ابن مہیب کی "تخمیسات العشر بنیات الفازاریہ" کی شرح لکھی، جو رسول اللہ صلعم کی مدح میں ہے لیکن یہ کتاب تکمیل کو نہ پہونچی، منطق میں مغیلی کی منظومہ کی بہت عمدہ شرح لکھی، ان کے علاوہ اور بھی حواشی اور شروح آپ کی تالیفات سے ہیں ان کے حلقۂ درس میں محمود بن عمر الفقیہ کے صاحبزادوں محمد، احمد، عبداللہ اور عبدالرحمن نے اصول، بیان اور منطق وغیرہ پڑھی، بابا تنبکتی نے بھی اپنے والد سے استفادہ کیا انھوں نے بیٹے کو کل اجازتیں اپنے ہاتھ سے لکھکر دیں۔ بابا تنبکتی نے صحیحین، موطا، اور شفا کی قراۃ اپنے والد سے سنی انھوں نے ۹۹۱ھ میں وفات کی۔

اس لئے "نیل الابتہاج" کا وہی درجہ ہے جو شاہ ولی اللہ (دہلوی) کے خاندان کے کسی متبحر عالم کی کتاب کا رتبہ ہو سکتا ہے، بابا تنبکتی نے آنکھ کھولی، تو خود کو فقہا، محدثین اور زہاد کی آغوش میں پایا خاندان کا ہر فرد قال اللہ اور قال الرسول کا ورد رکھتا تھا، بچپن ہی سے فقہ و حدیث، تفسیر و ادب کے نکات سے گوش آشنا تھے، ایسے علامہ ابن علامہ کی تصنیف کی اہمیت تعارف سے مستغنی ہے، "نیل الابتہاج" نہ صرف فقہائے مالکیہ کی تاریخ ہے، بلکہ اس کی ہر سطر سے ادب و انشا کی بھی پوری حلاوت ملتی ہے بایں ہمہ اسمیں شک نہیں کہ تحقیقات کی وسعت اور مواد کی فراہمی کے اعتبار سے ابن فرحون کی دیباج المذہب کو بابا تنبکتی کی کتاب پر فوقیت حاصل ہے، ابن فرحون نے موطا کے بعض ایسے شروح کا تذکرہ کیا ہے کہ کشف الظنون حاجی خلیفہ اور مدارک قاضی عیاض میں بھی ان کا ذکر نہیں اسی طرح امام مالک کے بعض ایسے حالات فراہم کئے ہیں کہ ان کے بغیر کوئی تذکرہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا، لیکن کتب متداولہ میں ان کا پتہ نہیں۔ لہٰذا ایک مورخ کیلئے جو امام مالک کی زندگی اور موطا پر قلم اٹھائے ابن فرحون اور احمد بابا التنبکتی سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔

نام و نسب امام مالک کے نسب و حسب کے متعلق سید صاحب کی کتاب میں صحیح واقعات نہیں ملتے بلکہ اس مسئلہ میں تو تحقیق و استقرار کے اعتبار سے کتاب بالکل ناقص اور غیر معتبر ہے میں یہ تو

کہہ نہیں سکتا کہ نسب وحسب کے سلسلہ میں سید صاحب نے محدثین ومورخین کی روایات کو چھپایا ضرورت اسکی تھی کہ مختلف روایات کو نقل کرکے صحیح نتیجہ اخذ کیا جاتا، مگر کیا کیجئے ہندوستان میں برہمنی تمدن کے برکات نے مسلمانوں کو بھی اس قدر جادۂ اعتدال سے ہٹا دیا ہے کہ ہر مصنف اور مولف اپنے ہیرو کو کسی جلیل القدر بادشاہ، کسی برگزیدہ ولی، یا پھر "سادۃ الاشراف" کے طبقہ سے نیچا دکھانا پسند نہیں کرتا، حالانکہ سیکڑوں محدثین کبار اور فقہائے عظام موالی اور مولدین میں سے گزرے ہیں لیکن ان کی علمی جلالت شان ان کی للٰہیت وخدا پرستی، ان کے بلند کردار نے دنیا کی نظر میں ان کو بہت سربلند ومحترم بنائے رکھا، اور آج بھی دنیا نہایت ادب واحترام کے ساتھ ان کا نام لیتی ہے کون نہیں جانتا حضرت حسن بصری، محمد بن سیرین، سعید بن جبیر، عطاء بن یسار، ربیعہ الرائی، ابن جریح موالی تھے، موطاء کے بہترے نسخوں کے مدونین ابن فہر (مولود ۱۲۵ھ) بنو فہر کے غلام تھے، ابن القاسم (مولود ۱۳۱ھ) کو "عتقی" کہا جاتا ہے اس کی وجہ بعض یہ بتاتے ہیں کہ وہ زبید بن حارث عتقی کے غلام تھے، معن بن عیسیٰ جو موطاء کے علاوہ بخاری کی بھی رواۃ میں ہیں "ولاء" ہی کی وجہ سے "اشجعی" کہلاتے ہیں آپ بنی اشجع کے غلام تھے، یحییٰ بن بکیر (متوفی ۲۳۱ھ) بھی رواہ بخاری میں ہیں ان کو بھی بنی مخذوم کی غلامی کا شرف تھا سعید بن عفیر جو نہ صرف ایک نسخہ موطاء کے مرتب ہیں بلکہ بہت بڑے نسابہ، مورخ اور شاعر بھی تھے انصار کے غلام تھے، ابن مبارک محدث بھی اسی صف میں نظر آتے ہیں پھر بھی زندگی اور بعد مرگ عالم اسلام میں انکو جو عزت وامتیاز حاصل ہے وہ تاریخ وروایات کی چھپی ہوئی حقیقت نہیں کسی ہیرو کی زندگی پیش کرنے میں یہ ضروری نہیں کہ اس کو مواہب فطرت کی مکمل تصویر بنا کر رکھا جائے اگر اس نوع کی سعی باطل کی گئی تو اس میں شک نہیں کہ آپ کی نگارش جمیل کی تو داد مل ہی جائے گی لیکن ظاہر ہے کہ کسی کی لائف محض شعر گوئی اور مصوری نہیں کہ ذوق سماع اور جلوۂ نظر کے لئے سامان تسکین بن سکے۔ بلکہ یہ بلاواسطہ قومی سرمایہ ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ قوم کے اندر ہیرو کی تقلید کا رجحان پیدا کیا جائے، اس کی بلند شخصیت اور اس کا کردار افراد قوم میں مماثلت کا ذوق پیدا کر دے اگر کوئی مصنف اپنے ہیرو کی شخصیت، الوہیت اور مابعد الطبیعہ کے جامہ میں پیش کرے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ساری کاوکاو خامہ فرسائی ایک نگارخانہ تو بن جائے گی لیکن قوم کے لئے پیام روح نہ بن سکے گی، آیئے ذرا مسئلہ تقلید اور قومی ترقی پر نفسیاتی نقطہ نظر سے ایک سرسری بحث کرلیں۔

دنیا میں تمدن کی ترقی بسا اوقات تقلید کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے تقلید وتتبع کے ذریعہ ایک قوم یا فرد دوسری قوم یا فرد سے نئے خیالات، نئے تجابات، جدید طور وطریقہ حاصل کرتا ہے اس تقلید کا محرک قومی یا انفرادی وقار وبرگزیدگی ہے، پروفیسر میک ڈاؤگل لکھتا ہے :-

جس قوم کی تقلید کی جاتی ہے وہ ایک ارفع اور بلند تر تہذیب کی علمبردار اور زیادہ قوت واقتدار کی

حاصل ہوا کرتی ہے۔ اس کی بہترین نظیر جو تاریخ کے اوراق میں نظر آتی ہے وہ مغربی یورپ کی قوموں کا جنہیں رومیوں نے فتح حاصل کرلی تھی، اور اس کے بعد ان قوموں کا جنھوں نے رومیوں پر فتح حاصل کی، رومی زبان، رومی مذہب، رومی قوانین و فن تعمیر کی تقلید کرنا ہے۔ رومیوں نے اپنی مادی تہذیب اور اس کی خاص صورتوں کا اثر ان اقوام پر اس وقت تک قایم رکھا جبکہ ان کی فوجی قوت میں انحطاط ہوچکا تھا۔ اسکے برعکس رومیوں نے یونانی دنیا پر فتح حاصل کرلی، لیکن یونانیوں نے رومی تہذیب کی تقلید نہ کی، بلکہ خود رومیوں نے تہذیب کے اعلیٰ عناصر یونانیوں سے لئے اس کی وجہ یہ تھی کہ فن ادب کے تمام شعبوں میں یونانیوں کا وقار (Prestige) رومیوں کی بہ نسبت زیادہ تھا۔

قومی تقلید کا بڑا اثر جو تمدن کی ترقی پر پڑا ہے اس کی توضیح قومی فنون بالخصوص فن تعمیر کے مطالعہ سے ہوتی ہے ہر قوم کی ممتاز فنی صورتوں کو در بازیادہ آبائی ماخذوں کی پیداوار کہہ سکتے ہیں انھیں ماخذوں کے اختلاط سے ہر جدید قومی فن کا وجود ہوا کرتا ہے ماہرین آثار قدیمہ کا بڑا فرض ہے کہ ان سرچشمہ ہائے اثر اور ان اختلاط کے نتائج کا پتہ لگائیں۔ کسی قوم کے اندر طبقہ امرا کا وجود بڑی حد تک قومی ترقی کی ضمانت ہے کیونکہ طبقہ امرا کے افراد ایک مشترک دستور (Standard) پیش کرتے ہیں اور اسی کو عام جماعت اختیار کرلیتی ہے اس کے برخلاف جن قوموں کے اندر طبقۂ امرا کا وجود نہیں وہ ترقی کے میدان میں پیچھے ہیں یہی حالت ان اقوام کی ہے جن میں نسلی امتیاز ہے کیونکہ اس طبقہ کی جو نسلاً ممتاز ہے تقلید نہیں کی جاسکتی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں برہمنی تہذیب زوال پذیر ہے اور روسی تمدن کی پسماندگی بھی انھیں حالات کا نتیجہ ہے کیونکہ فاتح شمالی آدمیوں یعنی ([illegible]) نے ایک عسکری اور امیرانہ نظام قایم کیا لیکن یہ جماعت (Standard) دیہاتیوں کی تہذیب میں معاون نہ ہوئی، کیونکہ یہاں کوئی ایسی درمیانی جماعت موجود نہ تھی، جو امرا کی تقلید کرتی، چین کے اندر تمدن کے اعتبار سے یکسانیت اور استقرار پایا جاتا ہے اور اسکے برعکس جاپان مغربی خیالات کی اثر پذیری میں تیزی کے ساتھ پیش پیش ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چین میں مقامی طبقہ امرا کا فقدان ہے عہد جدید میں جاپان میں مقامی امرا کی باوقار جماعت نے مغربی تمدن کے تخیلات کی تقلید شروع کی اور انھیں اجنبی خیالات و تعلیمات کے مجموعہ کو جمہور کے سامنے پیش کیا اسی وجہ سے جاپانی تمدن بہت اہم اعتبارات سے تیزی کے ساتھ ترقی پر ہے اس کے برعکس چین میں مقامی طبقۂ امرا کا وجود نہیں چونکہ منچوریا کے امرا کو لوگ وحشی غاصبین (Usurpers) خیال کرتے ہیں اور ان کا کوئی وقار نہیں اس لئے وہ جاپانی امرا کی طرح قدرتاً تمدن کی ترقی میں باوجود ارادہ بھی کوئی حصہ نہیں لے سکتے، چین میں جو طبقہ برسر حکومت ہے اس کے افراد کا انتخاب علمی فوقیت کی بنا پر جمہوری کے طبقات

سے ہوا کرتا ہے اس لئے یہ طبقہ بھی کوئی موروثی جماعتی وقار نہیں رکھتا، اس لئے یہ بھی اپنے مغربی تمدن کے خیالات سے عام لوگوں پر اثر نہیں ڈال سکتا۔ انگلستان میں بھی قومی خیال، قومی جوش، قومی طور و طریقہ پر امرا کا گہرا اثر ہے عام طور پر ایک انگریز ایک لارڈ سے محبت کرتا اور اس کی تقلید کرتا ہے۔

کسی فرد کے خیالات کو اس کے اہل وطن قبول کریں گے اس کا مدار زیادہ تر خیالات کی خوبی یا بلندی پر نہیں بلکہ اس وقار پر منحصر ہے جو یہ فرد اپنی سوسائٹی میں رکھتا یا حاصل کر سکتا ہے جدید مذاہب کے بانی ہمیشہ باوقار افراد ہوئے ہیں یہ وقار ان کو خواہ اپنی عادت کی قوت کے ذریعہ حاصل ہوا ہے یا اس شہرت کی بنا پر کہ ان کے پاس مابعد الطبعی قوتیں ہیں جس کا مظاہرہ بیخودی، اور وجد کی کیفیت کے ذریعہ ہوا کرتا ہے یا پھر معجزہ دکھانے یا معجزانہ پیدائش کے ذریعہ یا ان کل محاسن و صفات کی یکجائی کے باعث ان کو وقار حاصل تھا اسی طرح جب ایک بڑا جنرل اپنی عسکری مہموں کے لئے وقار حاصل کر لیتا ہے تو نپولین اول کی طرح ساری قوم پر اپنی جماعتی تنظیم کے خیالات کا اثر ڈال سکتا ہے، یہی حال اس مدبر کا ہے جو اپنی فصاحت اور پارلیمنٹری ہوشیاری کے ذریعہ وقار حاصل کر لیتا ہے تو وہ سیاسی زندگی کا سنگ بنیاد ڈال سکتا ہے اور دو جماعتوں کے اُصول کے ماتحت وہ تقریباً نصف قوم سے بلاچون وچرا اپنے خیالات تسلیم کرا سکتا ہے[1]۔

سیرت نگاری بھی ایک قومی کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے اس کے ذریعہ ہم افراد قوم کو پیام تقلید دیتے ہیں اس میں شک نہیں کہ موضوع کے لئے ایسے ہی فرد کا انتخاب کرنا چاہئے، جس کی برگزیدہ صفات جس کے بلند اخلاق، جس کی غیر معمولی اہلیت و استعداد ہم میں ذوق تقلید پیدا کر دے اگر کوئی شخص الوہیت اور ملکوتیت کے روپ میں ہمارے سامنے آئے گا اگر ہم اس کے صرف ایسے ہی وہبی اوصاف کو نمایاں کریں گے جو عام طور پر افراد میں نہیں مل سکتے، تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ افراد قوم میں نہ تو تتبع کا شوق پیدا ہوگا نہ تقلید کی اپج ہوگی اس میں شک نہیں زندہ افراد میں ہم ایسی ہی شخصیتوں سے اثر پذیر ہوتے ہیں جو مابعد الطبعی خصوصیات کے مالک ہوں جو اپنی خاندانی وجاہت اور پیدائشی سربلندی و برگزیدگی کے لئے سوسائٹی میں ممتاز نظر آتے ہوں لیکن مردہ افراد کی زندگی ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ ہم کو تقلید و تتبع کا پیام دیا جاتا ہے اگر ایسے افراد کی صرف وہبی کمالات و امتیازات پر زور دیا جائے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کا بڑا حصہ اس خیال کی بنا پر کہ اس میں یہ پیدائشی امتیاز مفقود ہے کوئی اہم اثر نہیں لے سکتا، اور اس طور سے ہم

---

[1] "مقدمہ نفسیات اجتماع" An Introduction to Social Psychology پروفیسر میک ڈاؤگل صفحہ ۲۸۸

سیرت نگاری کی بہت بڑی قومی اہمیت کو اپنے ذوق بے محابا کی بدولت تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں۔

سطور بالا سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عموماً اہل دنیا اپنی تنگ مائگی کی بدولت، شرافت و بزرگی، دولت و مکنت، سطوت و جبروت کے سامنے جبیں سائی کرتے ہیں لیکن یہ سارا اثر و تاثر زندگانی کا کھیل ہے مرنے کے بعد کسی انسان کی دولت و شرافت کا فسانہ افراد کے اندر کوئی انقیادی کیفیت نہیں پیدا کرتا بلکہ محض کردار کی بلندی اور اخلاق کی شرافت قوم کے لئے پیام روح بن سکتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہم ان غیر ضروری مباحث میں اُلجھیں گے تو اصل قومی ضرورت پوری نہ ہو سکے گی، بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ قوم کے سامنے غریبوں، ناداروں، معمولی طبقہ اور غیر معروف خاندان کے اکابر رجال کی زندگی پیش کی جائے، ان کی بزرگی و عظمت کے مستند تاریخی روایات نقل کئے جائیں اور ان کے اسباب ترقی کا صحیح خط و خال نمایاں کیا جائے، کیونکہ قوم میں زیادہ تر تعداد انھیں لوگوں کی ہوتی ہے اگر ہم کسی امیر کی زندگی پیش کرنے میں سیادت و ملوکیت پر زیادہ زور صرف کریں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ غربا اور مساکین میں تقلید کا شوق نہ ہوگا بلکہ وہ قدرت کی "خاص بارش کرم" پر ایک آہ یا واہ کرکے چپ ہو رہیں گے، اور اس صورت سے ایک نہایت اہم قومی مقصود ہمارے فریب ذوق کی بنا پر فسردہ ہو کر رہ جائیگا ــــ اب آئیے سید صاحب کے الفاظ پر غور کریں۔ فرماتے ہیں :-

مالک نام ابو عبداللہ کنیت امام دار الہجرۃ لقب باپ کا نام انس تھا سلسلۂ نسب یہ ہے، مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمر بن حارث بن غیمان بن جثیل بن عمرو بن حارث ذی اصبح (ص ۳)

سید صاحب نے ابی عامر کے والد کا نام "عمر" لکھا ہے حالانکہ ان کا نام "عمرو" تھا اسی طرح "غیمان" کے والد کا نام "خثیل" تھا سید صاحب "جثیل" بتاتے ہیں، یہ تصحیف کا نتیجہ ہے جیسے بعضوں کو غلط فہمی ہو گئی اور انھوں نے "عثمان بن جمیل" یا "عثمان بن حنبل" لکھا، امام دارقطنی "جثیل" بتاتے ہیں۔ الغرض سید صاحب کی کتاب میں امام مالک کے اجداد میں سے دو صاحبوں کا نام غلط درج ہے۔

اس کے بعد سید صاحب فرماتے ہیں :-

امام مالک ایک خالص عرب خاندان سے تھے جو جاہلیت و اسلام دونوں میں معزز تھا بزرگوں کا وطن یمن تھا مگر اسلام کے بعد مدینۃ النبی میں سکونت اختیار کی امام یمن کے اخیر خاندان شاہی یعنی حمیر کی شاخ "اصبح" سے تعلق رکھتے تھے، امام کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے، اسی لئے ذی اصبح کے لقب سے وہ مشہور ہیں، (ص ۳)

علامہ ابن فرحون مدنی لکھتے ہیں :-

"واما ذو اصبح فقد اختلف فی نسبہ اختلافاً کثیراً ولا خلاف انہ من ولد قحطان" (الدیباج ص ۱۷) اور لیکن "ذو اصبح"

ان کے نسب میں بہت زیادہ اختلاف ہے، لیکن یہ مسلم ہے کہ قحطان کی نسل سے ہیں)

ابن اسحاق کا قول ہے کہ "حارث ذی اصبح" بنی تیم بن مرہ کے غلام تھے، ابن شہاب زہری فرماتے ہیں:۔ "حدثنی نافع بن مالک مولی التیمیین"، (مجھ سے نافع بن مالک بنی تمیم کے غلام نے حدیث بیان کی)

ابن عبدالبر نے اس پر جرح کی ہے اور کہتے ہیں ابن شہاب سے ایسی کوئی روایت صحیح نہیں، قاضی ابوالفضل فرماتے ہیں کہ ابن شہاب کی یہ حدیث بخاری کی کتاب الصیام کے اول میں مروی ہے[۱]، الغرض ابن عبدالبر کا یہ کہنا کہ ابن شہاب نے نافع بن مالک کو "مولی بنی تمیم" نہیں کہا ہے، صحیح نہیں اسی کے ساتھ وہ لغوی حیثیت سے "مولی" کے معنی دوست اور حلیف بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ابن شہاب نے نافع بن مالک کو اسی معنے میں "مولی بنی تمیم" لکھا ہے، قرآن مجید میں بھی "مولی" اور "موالی" مختلف مقامات میں استعمال ہوئے ہیں، اور ان سے دوست کے معنی ظاہر ہوتے ہیں۔

عبدالملک بن صالح کی روایت ہے کہ "ذی اصبح" قریش کے غلام تھے، ابن فرحون نے امام مالک کے چچا ابوسہیل کی یہ روایت نقل کی ہے۔

"نحن قوم من ذی اصبح قدم جدنا المدینۃ فتزوج فی التیمیین فکان معھم ونسبنا الیھم"۔ (ہم ایسی قوم ہیں جس کا سلسلہ "ذو اصبح" سے ملتا ہے ہمارے دادا مدینہ تشریف لائے، اور قبیلہ بنی تیم میں شادی کی انھیں کے ساتھ رہتے اور ہمارا نسب ان کی طرف ہے)۔

زبیر بن بکار کی روایت ہے کہ امام مالک کی والدہ کا نام عالیہ بنت شریک بن عبدالرحمن بن شریک الازدیہ ہے ابن عایشہ کا قول ہے کہ ان کا نام "طلحہ" تھا جو عبداللہ بن معمر کی لونڈی تھیں ابن عمران التیمی کہتے ہیں:۔

"ما بیننا وبینہ نسب الا ان امہ مولاۃ لعمی عثمان ابن عبداللہ"۔ (ہمارے ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں سوائے اس کے کہ ان کی والدہ ہمارے چچا عثمان بن عبداللہ کی لونڈی تھیں)۔

ابن عمران کی روایت سے اگلی روایات کی تطبیق دیکھئے، تو ابن شہاب کی روایت "حدثنی نافع بن مالک مولی التیمیین" اور ابن اسحاق کی روایت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ امام صاحب کے آبا و اجداد ذی اصبح اور قحطان کی نسل سے ہیں لیکن مادری سلسلہ بنی تیم سے ملتا ہے اور چونکہ بنی تیم کی ایک مولاۃ (لونڈی) کو امام صاحب کے والد نے اپنی زوجیت میں لیا اس لئے راویوں کو شبہ ہو گیا کہ "ذی اصبح" ہی بنی تیم کے غلام تھے، حالانکہ ابوسہیل کے بیان کے مطابق جو راوہ حدیث میں ہیں انکے دادا نے بنی تیم میں شادی کی تھی۔

---

[۱] "ذلک بان اللہ مولی الذین آمنوا و ان الکافرین لا مولی لھم (سورۂ محمد)

روایات بالا کی تنقیح کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ امام مالک کا آبائی سلسلہ نسب تو یقیناً قحطان سے ملتا ہے لیکن مادری سلسلہ اس سے مختلف ہے آج ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے شریف گھرانوں میں جس نوع کی سینہ زوریاں برتی جاتی ہیں وہ حد درجہ اندوہناک ہیں اہل اسلام کی اسی "برہمنیت" اور مسلمانوں کی اسی ہندوانہ ذہنیت نے اکابر رجال کو فسردہ بناکر رکھدیا، ایک سید یا شیخ، پٹھان یا ملک اپنے اگر اپنی پشتینی روایات سے الگ ہوکر ازدواجی تعلق قائم کیا تو پھر ایسی اولاد کا ہماری سوسائٹی میں کوئی وقار نہیں اس ننگ تمدن نے جو ہندو معاشرت سے اثر پذیری کا نتیجہ ہے ہماری قوم میں اخلاق کے بدترین نتائج پیدا کر رکھے ہیں مسلمانوں کی انھیں معاشرانہ سیہ کاریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد "نگار" میں ایک اہم مضمون لکھا جاچکا ہے جس سے ہرچند بعض طبقہ چیں بہ جبیں ہوا لیکن عام مسلمانوں نے اس کو شرف قبولیت بخشا، اگر مسلمان بالخصوص اصطلاحی شرفا اپنی ہستی قایم رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے خطرناک مستقبل پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے، اول تو سادات و شیوخ، پٹھان و ملک خود کو عام مسلمانوں سے ممتاز سمجھتے ہیں ان کا یہی نسلی پندار ان کی اجتماعی زندگی کے لئے مہلک ہے، دوسری مصیبت جو ایک مستقل بلائے آسمانی کی طرح ان پر مسلط ہوچکی ہے، وہ یہ ہے کہ خود اپنے دست و بازو کی قطع و برید کر کے اپنی قوت و نشاۃ کو تباہ و برباد کر رہے ہیں ایک ناقد سخت حیران رہجاتا ہے جب وہ کسی عالم کی تصنیف میں اس نوع کی رکاکت افکار کا مطالعہ کرتا ہے حالی مرحوم کی قوم پرستی اور اجتماعی شاعری کو کونسا مسلم ہے جو بہ نظر استحسان نہ دیکھیگا لیکن "حیات جاوید" میں انھوں نے اس نوع کے جو ہفوات پیش کئے ہیں وہ ان کی قومی زندگی کو حد درجہ مطعون بنانے والے ہیں کتب انساب میں نسلی اختلاط کے جو عجیب و غریب مظاہرے نظر آتے ہیں وہ ہماری معاشرت کے رسوم و قیود کی دنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کردینے والے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اول تو "انساب" ہی سے ناواقف رہتے ہیں اور جو واقف ہیں وہ محض رسوم کی نقالی کرتے ہیں ان میں اتنی بھی جرأت اخلاق نہیں کہ عام انسانوں تک صحیح واقعات تو پہونچا دیں گو وہ عملاً کوئی انقلاب کرنا پسند نہ کریں۔

سید صاحب نے امام مالک کے جد محترم حضرت مالک کی جلالت قدر اور رفعت منصب کے سلسلہ میں بہت سے اہم تاریخی واقعات نہیں لکھے، ابومحمد ضراب کی روایت ہے کہ مالک بن ابی عامر متوفی ۱۱۲ھ کو حضرت عثمان نے افریقہ کی مہم پر بھیجا تھا اور انھوں نے اس کو فتح کیا قاضی محمد بن احمد التستری کا بیان ہے کہ حضرت عثمان جب قرآن جمع کر رہے تھے، تو مالک بن ابی عامر مصاحف کی کتابت کرتے تھے۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز آپ سے مشورہ لیتے تھے، اور خود امام مالک نے جامع موطا میں اس کا تذکرہ کیا ہے، ابواسحاق بن شعبان فرماتے ہیں کہ امام مالک نے اپنے والد (انس) سے انھوں نے اپنے دادا (مالک) سے انھوں نے حضرت عمر سے غسل اور لباس کی حدیث روایت کی ہے

امام مالک کی اولاد

کسی ہیرو کے قومی کاموں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہماری نفسیات کا تقاضا ہے کہ ہم اس کے ذاتی حالات جاننا چاہتے ہیں اس کی نجی زندگی، اس کے احباب اس کی اولاد، اس کے وطن اور ماحول اس عہد کی سیاسی فضا وغیرہ سے بحث کرنا سیرت نگار کا فرض ہے لیکن کس قدر تعجب ہوتا ہے جب سید صاحب کی کتاب میں ہم امام صاحب کی اولاد کا حال ڈھونڈھتے ہیں اور اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں پاتے، حالانکہ امام صاحب کو خدا نے ہونہار بیٹے بھی دئے تھے، اور ایک عالمہ فاضلہ بیٹی بھی عطا فرمائی تھی۔

آپ کے دو صاحبزادے تھے، یحیٰ اور محمد اور صاحبزادی کا نام فاطمہ تھا جو امام صاحب کے بھانجے اسمٰعیل بن ابی ادیس سے بیاہی تھیں، یحیٰ نے امام مالک سے موطا کے ایک نسخہ کی روایت کی ہے آپ سے محمد بن مسلمہ روایت کرتے ہیں امام صاحب کے دوسرے صاحبزادے "محمد" مصر میں تشریف لے گئے۔ حرث بن مسکین نے آپ سے روایت کی ہے، قاضی سلیمان بن سالم القطان معروف بہ ابن الکحالہ (متوفی ۲۸۱ھ) نے جو امام سحنون کے اصحاب میں معروف شخصیت رکھتے ہیں مدینہ میں محمد بن امام مالک سے ملاقات کی انھوں نے اپنے والد کی روایت سے ایک حکایت سنائی۔

ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ امام صاحب کے تین بیٹے تھے اور ایک بیٹی تھیں، یحیٰ، محمد، حماد، اور ام البنین، ابن فرحون لکھتا ہے:-

"کانت لمالک ابنۃ تحفظ علمہ یعنی الموطاء وکانت تقف خلف الباب فاذا غلط القاری نقرت الباب فیفطن فینظر مالک فیرد علیہ" (الدیباج ص ۱۸) — (امام مالک کی ایک صاحبزادی تھیں جو آپ کے علم یعنی موطاء کی حافظہ تھیں آپ دروازہ کے پیچھے ٹھیری رہتیں جب قاری کوئی غلطی کرتا تو آپ دروازہ کھٹکھٹاتیں امام صاحب سمجھ جاتے اور مخاطب ہو کر غلطی کی تصحیح کر دیتے)۔

امام صاحب حدیث پڑھا رہے ہوتے اور آپ کے صاحبزادہ مجلس میں وارد ہوتے، اس ہیئت کے ساتھ کہ آپ کے ہاتھ میں چڑیا اور کیسانی پاپوش ہوتا آپ کا پاجامہ زمین سے لٹکتا رہتا، امام صاحب اپنے اصحاب کی طرف مخاطب ہوتے، اور فرماتے، بیشک ادب اللہ ہی کی دین ہے یہ میرے صاحبزادے ہیں اور وہ میری صاحبزادی ہیں یعنی صاحبزادے ایسے ہو لہو پسند، اور صاحبزادی ایسی عالمہ فاضلہ، امام صاحب کو یحیٰ کی ان اداؤں سے کچھ مایوسی تھی، امام صاحب مجلس میں حدیث پڑھاتے ہوتے، یحیٰ آتے جاتے لیکن بیٹھتے نہیں امام صاحب اصحاب کی طرف دیکھتے اور فرماتے کہ صاحبزادہ کا یہ رنگ رہا تو وراثت علمی پہونچ چکی، اس کے بعد حسرت کے ساتھ کہتے کہ میں نے کسی باپ کا صحیح جانشین دیکھا تو عبدالرحمٰن بن قاسم

(بن محمد بن ابی بکر) کو، آپ کے دوسرے صاحبزادہ محمد کے ایک لڑکا تھا ان کا نام احمد تھا، انھوں نے اپنے دادا امام مالک سے حدیث سنی، ابو عبداللہ بن مفرج القرطبی نے ان کو امام صاحب کے رواۃ میں شمار کیا ہے اسی طرح حافظ ابو بکر الخوارزمی البرقانی نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر کیا ہے احمد بن محمد بن امام مالک نے ۲۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔

تصنیفات سید صاحب کی کتاب میں امام مالک کی بعض اہم تالیفات و تصنیفات کا تذکرہ نہیں کیا گیا، حالانکہ آپ کی ایک تالیف "کتاب السیر" ہے اور ایک رسالہ آپ نے اجماع اہل مدینہ پر لیث بن سعد کے لئے لکھا، نجوم پر بھی آپ کا ایک رسالہ تھا اگلے زمانہ میں فقہا و ائمہ صرف فقہ و حدیث تفسیر و رجال کے فاضل نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ تاریخ و انساب، شعر و ادب، طب و ریاضی، میں بھی مہارت رکھتے تھے، اور بعض موسیقی و غناسے بھی دلچسپی رکھتے تھے، جیسے ابن مبارک محدث، اور قاضی ابن فرکون وغیرہ ابن حبان محدث کو بھی نجوم میں ید طولیٰ حاصل تھا، اسی طرح فقہائے مالکیہ میں بعض جلیل القدر منجم گزرے ہیں چنانچہ ابن البنا المراکشی بہت بڑے ہیئت داں اور منجم تھے، احمد بابا التنبکتی لکھتے ہیں:-

"فاخذ من وقتہ فی علم الھیئۃ والنجوم حتی ادرک منہ الغایۃ"۔ (اپنے زمانہ کے علم ہیئت اور نجوم کی تعلیم حاصل کی یہاں تک اس فن کی انتہا کو پہونچ گئے)۔

آپ نے اس فن پر بعض اہم کتابیں لکھیں جو حسب ذیل ہیں:-

منہاج الطالب فی تعدیل الکواکب و استطیل۔ تالیف فی احکام النجوم۔ مقالہ فی علم اسطرلاب، قانون فی ترحیل الشمس۔

اسی طرح ابو مروان عبدالملک بن حبیب (متوفی ۲۳۸-۲۳۹ھ) جہاں بہت بڑے محدث اور مالکی فقہ کے ماہر تھے، ایک بے مثل نحوی و عروضی، نسابہ و مورخ تھے وہاں آپ کو نجوم میں بھی درک تھا یہاں تک کہ آپ نے اس فن پر ایک معتبر کتاب لکھی، علامہ ابن فرحون نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

"الغرض امام مالک کو نجوم میں بھی مہارت تھی، ابن فرحون لکھتا ہے۔

کتابہ فی النجوم و حساب مدار الزمان و منازل القمر و ہو کتاب جید مفید جدا قد اعتمد علیہ الناس فی ہذا الباب و جعلوہ اصلاً"	آپ کی کتاب نجوم اور اختلاف موسم کے حساب و چاند کی منزلوں کے باب میں ہے وہ بہت عمدہ اور حد درجہ مفید ہے، لوگوں کی نظر میں یہ اس فن کی قابل اعتماد چیز ہے اور اسکو وہ اس علم کی اصل کتاب سمجھتے ہیں

غالباً اسی کا اثر ہے کہ ابن البنا مراکشی اور عبدالملک بن حبیب اندلسی جیسے فقہائے مالکیہ کو بھی اس فن سے شغف تھا۔ اور انھوں نے اس پر اہم کتابیں لکھیں سید صاحب نے امام صاحب کی مفصلہ بالا

تین کتابوں میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔

حفاظ موطا: کلام اللہ کے بعد اسلامی دنیا میں جو رتبہ موطار کو حاصل ہوا اسکی نظیر اسلامی ادبیات میں نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ جس کثرت سے قرآن مجید کی تفسیریں لکھی گئیں، دوسرے درجہ میں اسی طرح موطا، کی بھی شرحیں مرتب ہوئیں قرآن مجید کے بعد لوگ اس کو بھی حفظ کرنے لگے، چنانچہ موطا، کے حفاظ میں بڑے بڑے جلیل القدر محدثین وفقہاء کے اسمار نظر آتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ سید صاحب نے اپنی کتاب میں ان میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کیا ذیل میں چند حفاظ کے اسمار لکھے جاتے ہیں:-

ابو الفضل عباس بن عیسی الممسی متوفی ۳۳۳ھ — آپ بہت بڑے فقیہ فاضل اور عابد تھے، مناظرہ میں متکلمین اور فقہا کی طرح زور بیان رکھتے تھے، مذہب مالکی میں آپ کو حجت سمجھا جاتا ہے مصر اور مکہ میں اکابر محدثین سے حدیث سنی آپ سے بڑے بڑے لوگوں نے استفادہ کیا وطن میں لوٹ کر آتے، تو گوشۂ عزلت میں بیٹھکر عبادت کرتے لیکن اہل زمانہ نے یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا، آپ کو شہید کر دیا گیا آپ نے آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور پندرہ سال کے ہوئے تو موطار کے حافظ ہو گئے۔

احمد بن محمد معروف بہ ابن تقی — (مولود ۸۰۵ھ) آپ ایک علمی گھرانہ کے چشم وچراغ تھے، مصر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، آپ کے ماموں قاضی تاج الدین بہرام بہت بڑے فقیہ تھے، آپ سے شہاب قرافی نے پڑھا، ابن تقی نے اپنے ماموں کے علاوہ شمس بن مکین اور عبد المجید طرابلسی سے استفادہ کیا آپ کا حافظہ بہت قوی تھا، اور اس کے لئے آپ بہت مشہور ہیں، مختصر ابن حاجب کا پورا ورق دو یا تین مرتبہ پڑھتے اور حفظ ہو جاتا چھ دن میں "العمدہ" اور سات دن میں "الفیہ" حفظ کر لیا، احمد بابا التنبکتی فرماتے ہیں:-

"ان السراج الاسوانی انشد قصیدۃ مطولۃ من انشاءٍ وکررہا مرۃ او مرتین فاحب صاحب الترجمۃ اخجالہ فقال لہ انہا قدیمۃ فانکر السراج ذلک فبادر صاحب الترجمۃ وسردہا"

سراج اسوانی نے اپنا لکھا ہوا ایک طویل قصیدہ ایکبار یا دو بار پڑھا، ابن تقی کو مذاق سوجھا، اور انھوں نے سراج کو شرمندہ کرنے کے لئے کہا کہ یہ تو پرانا ہے لیکن سراج نے اس سے انکار کیا۔ ابن تقی نے تیزی سے پورا قصیدہ سنایا۔

دربار سنجری کا مشہور شاعر معزی بھی شعرا کو بھرے دربار میں اسی طرح ذلیل کیا کرتا یورپ کے مشہور شاعر والٹیئر کو ایک انگریز شاعر نے اسی طرح ذلیل کیا تھا ایک روایت یہ بھی ہے کہ بعض شیوخ نے عید کے دن آپ سے پوچھا کہ کیا خطبہ رجاتم زبانی پڑھ سکتے ہو آپ نے کہا نہیں مگر اس کا کوئی نسخہ ہو تو دکھائے لوگوں نے ایک نسخہ دیا اس میں عید کے خطبوں کے ساتھ احادیث اور مواعظ بھی تھے، آپ نے ایک گھنٹہ سے کم ہی اس کو پڑھا اور لوگوں کے سامنے زبانی سنا دیا۔ آپ قرآن مجید اور موطار دونوں کے حافظ تھے۔

یحییٰ بن زکریا بن ابراہیم بن مزین ---- (متوفی ۲۵۹-۶۰ھ) آپ حضرت عثمان غنی کی صاحبزادی بی بی رقیہ کے غلام تھے، آپ کی اصل بلاد اندلس کے شہر طلیطلہ سے ہے اس کے بعد آپ قرطبہ میں جا رہے، امیر عبدالرحمٰن الداخل نے آپ کے لئے جایداد یں وقف کیں ایک مکان تعمیر کرا دیا اور گرانمایہ وظیفہ مقرر کر دیا علامہ ابن فرحون لکھتے ہیں۔ "کان حافظا للموطا، فقیہا فیہ" شارحین موطا، کے طبقہ میں آپ کو امتیاز حاصل ہے۔

ابو محمد علیم بن عبدالعزیز شاطبی ---- آپ ۵۰۰ھ میں شاطبہ کے اندر پیدا ہوئے اور ۵۹۴-۹۵ھ میں بمقام "بلنسیہ" وفات کی آپ حضرت عمر فاروق کی اولاد میں ہیں احمد بابا التنبکتی نے آپ کو "احد العلماء الزہاد" لکھا ہے، اور فرماتے ہیں :-

"وہو دأبہ کتب الحدیث والسنن سیما الموطاء والصحیحین یلقی احادیث من حفظہ وینصہا کانہ ینظر فی کتاب ویارتی فیہ بامر معجز"
(نیل الابتہاج ص ۲۱۴)

آپ حدیث اور سنن کی کتابوں خاصکر موطاء، بخاری، ومسلم کے کیڑے تھے، حدیث سند کے ساتھ اس طرح زبانی پڑھتے تھے گویا آپ اسکو کتاب میں دیکھ رہے ہیں اور اس معاملہ میں آپ کو اعجاز تھا۔

علامہ ابن فرحون نے ابن قراف (متوفی ۶۲۵ھ) کو بھی موطا، کا حافظ لکھا ہے، فرماتے ہیں :-

"واستظہر بالقاہرۃ المعزیہ موطاء الامام مالک حفظا من صدرہ عن ظہر القلب"

اور آپ نے قاہرہ معزی میں موطاء امام مالک پڑھا، اور اس کو زبانی یاد کر لیا۔

(باقی)

عبدالمالک آروی

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصًا غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے یا یوں سمجھئے کہ شعراء کی پاکیزہ زبان میں حُسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے آغاز عشق سے لیکر انجام عشق تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں، قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ اور متحد المضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مصرعہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں قیمت معہ محصول ڈاک ؏ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔ ملنے کا پتہ :- منیجر صاحب۔ دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

حسن اور کشاکشِ غمزہ

عورت اور اس کے حسن و جمال کو تاریخ انسانی میں جو اہمیت حاصل ہے ۔ اگر ہم اس کی کوئی تشبیہ موجودہ علوم و فنون کی زبان میں ڈھونڈھیں تو سوائے " برق و شعاع " کے کوئی دوسرا لفظ میسر نہیں آسکتا۔ وہی آنکھیں خیرہ کر دینے والی تابش، وہی رگ و پے میں سرایت کر جانے والی بجلی، وہی ایک بار اپنے دائرۂ کشش میں لاکر کبھی نہ چھوڑنے والی گرفت — اور — وہی " سوختم ایک ندانم بچہ عنوانم سوخت " قسم کی جلوہ پردازی جو بجلی میں ہے، عورت کے حسن میں بھی نظر آتی ہے ۔

آفات و مصائب سے بچانے کا قوی ترین ذریعہ مذہب سمجھا جاتا ہے لیکن عورت کے باب میں اسکی کمزوری کا بھی یہ عالم ہے کہ " صید از حرم کشد خم جعد بلند او " اور یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ جنگجو و خون آشام مردنے دنیا میں اپنے دشمن کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ " مئے مرد افگنِ حسن " کے سامنے اس کو ہمیشہ سپر ہی ڈالدینا پڑی ۔

عالم کا وہ کونسا واقعہ ہے جس میں کسی عورت نے حصہ لیا ہو اور ہنگامہ نہ بپا کر دیا ہو، دنیا کی وہ کونسی چنگاری ہے جسے عورت کے تنفس نے چھوا ہو اور اس نے " التہابِ جہنم " کی صورت نہ اختیار کر لی ہو۔ مرد کی تلوار نے اسی وقت سب سے زیادہ کاٹ دکھائی جب پہلے اُسے عورت نے زخمی کر دیا اور اس کے عزم میں اسی وقت کوہ تراش سنگینی پیدا ہوئی جب عورت کی سنگدلی نے اس سے " جوئے شیر " لانے کی فرمایش کی ہو۔ الغرض یہ دنیا ہمیشہ " آشوبگاہِ حسن " رہی ہے اور اس کی تاریخ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو " غمِ روزگار " سے کم " غمِ عشق " کا حصہ نظر نہ آئے گا مگر یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب لیلی مستور تھی اور قیس اس کے لئے سرگرداں رہا کرتا تھا، یعنی عشق کی فراوانی تھی صرف اس لئے کہ حُسن میں ارزانی نہ تھی اور وہ ہر مدعی کو " دار و رسن " کا مستحق نہ جانتا تھا۔ لیکن اب حالات کچھ اور ہیں ۔

پہلے حُسن و جمال صرف فطری ودیعت سمجھا جاتا تھا اور اب اس نے ایک تمدنی ضرورت اور علمی مسئلے کی حیثیت سے اکتسابی صورت اختیار کر لی ہے ۔ یعنے پہلے وہ ایک ایسا ہیرا تھا جو صرف معدن ہی سے دستیاب

ہو سکتا تھا، لیکن اب وہ بنایا بھی جا سکتا ہے اور اس کا سودا بھی ارزاں ہو جاتا ہے۔

چند سال قبل کی بات ہے کہ کاروباری دنیا میں سوائے رقص گاہوں اور تھیٹروں کے کوئی اور جگہ ایسی نہ تھی جہاں کاروبار کی کامیابی کا انحصار صرف عورت کے حسن و جمال پر رہا ہو، لیکن اب کوئی کارگاہ انسانی ایسی نہیں ہے جہاں عورت اور وہ بھی حسین عورت کی ضرورت کو محسوس نہ کیا جاتا ہو۔ جب کسی کارخانہ کو کسی عورت کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ صراحتاً اشتہار میں ظاہر کر دیتا ہے کہ اسے "مکروہ صورت عجوزہ" کی ضرورت نہیں ہے، دوکاندار مال فروخت کرنے کے لئے اکثر و بیشتر عورتوں ہی کی خدمات حاصل کرنا پسند کرتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ وہ کسی کا تقرر کریں عشق کے تمام زاویوں سے اس کے حُسن کا جائزہ لے لیتے ہیں تب کہیں جاکر اس کو جگہ دیتے ہیں۔ مدارس کے لئے جو اُستانیاں تلاش کی جاتی ہیں ان میں بھی سب سے پہلے حسن ہی کا عنصر تلاش کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ میں ابتداہی میں جمالیات کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اسپتالوں میں نرسیں بھی طرحدار ہی ڈھونڈھ کر رکھی جاتی ہیں کیونکہ "دلِ بیمار" کا علاج ظاہر ہے "چشمِ بیمار" سے بہتر اور کون کر سکتا ہے اسی طرح دائیوں اور کھلائیوں کا انتخاب بھی جمالیاتی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے تاکہ بچوں کے "احساسِ حُسن" اور "ذوقِ نظر" کو صدمہ نہ پہونچے۔ الغرض اس وقت ہر طرف عورت کی مانگ ہے اور عورت نام ہے صرف حُسن و شباب کا۔ گزشتہ جنگ سے قبل عورت اور اس کے حُسن و جمال کا تعلق صرف ازدواجی معاملات سے تھا، لیکن جب گزشتہ محاربۂ عظیم کے دوران میں خونخوار مرد اپنے ہی ابنائے جنس کے پھاڑ کھانے میں مصروف ہو گیا تو عورتوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اُن کاموں کو سنبھالیں جنہیں مرد ادھورا چھوڑ گئے تھے اور تمدن کی ان تمام داعیات کو پورا کریں، جن کی تکمیل کشاکشِ حیات تو نہیں لیکن کشاکشِ تعیش کے لئے یقیناً از بس ضروری تھی، چنانچہ وہ اپنے بچوں کے پالنے چھوڑ چھوڑ کر باہر آگئیں اور زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ ان پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ مرد کی آزادی جس پر وہ رشک و حسد کیا کرتی تھیں، پھولوں کی سیج نہیں ہے۔

عورت چونکہ ہر جگہ عورت ہے اور دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مرد کی مرتاض سی مرتاض نگاہ اس پر پڑی ہو اور کوئی التجا اس میں پنہاں نہ ہو، اس لئے ظاہر ہے کہ کاروباری دُنیا میں حُسن کے افادی پہلو کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ خداوندان تمدن و عمرانیت، آقایانِ صنعت و تجارت نے عورت کا خوشی سے خیر مقدم کیا، اپنی آغوشیں اُس کے لئے کھول دیں لیکن صرف اس شرط کے ساتھ کہ وہ جوان ہو، حسین و جمیل ہو، اور رعنائی و دلکشی کی مالک ہو۔

مرد کی اس خواہش کا علم ہوتا تھا کہ برسوں کے زنگ خوردہ آئینے عورت کے ہاتھ میں آگئے اور اس کی فکر کا تنہا مقصود یہ رہ گیا کہ وہ "زر و دولت" کے قایم کئے ہوئے معیار پر کیونکر پوری اترے،

اتفاق سے جنگ کے دوران میں ڈاکٹری کی ایک نئی شاخ اور پیدا ہوگئی تھی جو معیوب و بیکار اعضا کو مفید و کارآمد بنانے لگی تھی اس لئے عورتوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی اور چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں کہلاتی ہے اس لئے اس نے "حسین بننے اور بنانے" کا ایک فن ہی مستقل پیدا کردیا جس کے جاننے والے اب یوروپ کے ہر شہر میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

مغرب کی عورت میں اب یہ خواہش اتنی قوی ہوگئی ہے کہ وہ فاقہ کرسکتی ہے، خودکشی کرسکتی ہے، لیکن بدصورت رہنا اسے گوارا نہیں یہاں تک کہ معمر عورتیں بھی اپنے جسم کی جھرّیاں دور کراکرا کے جوان بن رہی ہیں اور جوان عورتوں کی کشمکش کا تو خیر پوچھنا ہی کیا کہ انھیں سر سے پاؤں تک ایک ایک عضو کا "حساب" دینا پڑتا ہے۔

"مقابلۂ حسن" کے بین الاقوامی جلسوں میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ کس عورت کی کونسی چیز زیادہ دلکش ہے اور اس طرح اب سر کے بالوں سے لیکر پاؤں کے انگوٹھے تک ہر ہر چیز کے متعلق اصول بنادئے گئے ہیں کہ کونسا عضو کب واقعی حسین کہلایا جاسکتا ہے اور کب وہ دائرہ حسن سے خارج۔

اس سے قبل عورت کے حسن کا ذکر آتا تھا تو زیادہ تر "نک سک" اور "ناک نقشہ" سے بحث کیجاتی تھی لیکن اب حالت یہ ہے کہ جب تک کوئی عورت ہر لحاظ سے وینس کا مرمریں مجسمہ بننے کی اہلیت نہ رکھتی ہو، وہ عورت کہلائے جانے کی مستحق ہی نہیں ہے اور نہ اسے اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق حاصل۔ رات دن ورزشیں ہورہی ہیں، دھوپ میں ساحلوں پر دوڑ لگائی جارہی ہے، شہسواری اور تیراکی کی مشقیں ہورہی ہیں، حرکات رقصیہ کی مزاولت جاری ہے اور ان سب محنتوں کا مقصود صرف وہی ایک اکتسابِ جمال ہے۔

یقیناً حسن و جمال عورت کا فطری حق ہے اور اس کے حصول و بقا کے لئے عورت کو کوشش بھی کرنا چاہئے، لیکن چونکہ عورت اس جنس کو لیکر اب بازار میں آگئی ہے اور وہ اس کا سودا چاہتی ہے اس لئے اسکو مرد کی خواہش کے سامنے جھک جانا پڑتا ہے، اپنے آپ کو اسی سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے جو مرد کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ خود اس کی ذاتی اہمیت اب کچھ باقی نہیں رہی ہے۔

عورت کے حسن و جمال کا سودا سب سے اچھا اس وقت سینما کی دنیا میں ہوتا ہے، لیکن یہاں کی مسابقت میں اُسے جتنی تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کرسکتا۔

کچھ زمانہ قبل تک سینما میں عورت کے حسن کا بڑا معیار اس کے جسم کی نحافت تھا اور اس کی اتنی سخت پابندی تھی کہ اگر کسی عورت کا وزن مقررہ وزن سے چند تولے بھی زاید ہوتا تھا تو اس کے لینے سے انکار کردیتے تھے۔ اس نزاکت یا "مدقوقیت" حاصل کرنے کے لئے عورت کو مسلسل فاقے کرنے پڑتے تھے اور تمام دنیا کی غذائیں ترک کرکے صرف چند مختصر ہلکی غذاؤں پر زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ ہالی وڈ میں کام کرنے والی بعض

عورتوں کی غذا صرف یہ تھی کہ صبح کو نصف لیموں کا افشردہ، دوپہر کو چند چمچے سابودانہ اور رات کو پھر وہی افشردۂ لیموں کیا ممکن تھا کہ وہ روٹی کا ایک ٹکڑا کھالیں یا دُنیا کی اور لذیذ غذائیں چکھ سکیں۔ لیکن اب یہ حالت باقی نہیں رہی ہے اور ان کو چند کیلو گرام اپنا جسم بڑھانے کی اجازت دی گئی ہے جس سے وہ بجائے نصف لیموں کے پورے لیموں کا افشردہ پی سکتی ہیں اور کبھی کبھی روٹی کا کوئی ٹکڑا بھی انھیں نصیب ہو جاتا ہے۔

عورت کے چہرہ پر ابرو کی ساخت بھی خاص چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن چونکہ سینما ایکٹرسوں کو مختلف اوقات میں مختلف جذبات پیدا کرنے کے لئے ابرؤں میں بھی تغیر پیدا کرنا پڑتا ہے اس لئے اب اُن کو بالکل صاف کرا دیا گیا ہے تاکہ جب جیسی ضرورت ہو موقلم سے بنائی جاسکیں۔

پہلے فراخ پیشانی لوازم حسن میں داخل تھی لیکن اب اس کی تنگی کو پسند کیا جاتا ہے اور اسی لئے بالوں کی آرائش اس طرح کیجاتی ہے کہ "پیشانیِ فراخ" معدوم ہو جائے۔ پھر یہ ذوق صرف سینما ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اونچی سوسائٹیوں میں بھی پایا جاتا ہے اور اس طرح اب یوروپ کی عورت صرف ایک ایسی صنعت رہگئی ہے جسے مرد کی ہر نگاہ کے ساتھ بدلتا رہنا چاہئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یوروپ کی عورت آزاد ہے لیکن خود اس سے پوچھئے کہ وہ کیسی سخت غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

غالبؔ مرگیا لیکن حسن بدستور "کشاکشِ غمزہ" میں مبتلا ہے اور "اہلِ جفا" کو ابتک آرام نصیب نہیں ہوا۔

"نگار" جنوری ۳۷ء

اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل جدید چیز ہوگا اور مفید ہونے کی حیثیت سے حد درجہ اہم۔ علوم و فنون اور ادب و انشاء کے متعلق اتنے مفید اور دلکش مضامین کا مجموعہ مشکل ہی سے آپ کو کہیں اور نظر آسکتا ہے۔

"ڈرامہ اصحاب کہف"

بھی مکمل اسی میں شائع ہوگا اور علاوہ اس کے اور بھی اکثر مضامین اڈیٹر کے قلم کے ہوں گے ضخامت بھی دو چند ہوگی۔

منیجر نگار لکھنؤ

سوئٹزرلینڈ کے وفاق کی چند خصوصیات

وفاقی حکومت کے عناصر

(بہ سلسلہ ماہ اگست ۳۶ء)

۲۔ فیڈرل کونسل گذشتہ صحبت میں ہم نے سوئٹزرلینڈ کی وفاقی حکومت کے چار عناصر بتائے تھے۔ اور ان میں سے پہلے عنصر فیڈرل لیجسلیچر پر روشنی ڈالی تھی۔ جو اُس ملک کے وفاقی نظام کا سب سے بڑا نمایندہ اور ذمہ دار ادارہ ہے۔ اب ہم دوسرے عنصر فیڈرل کونسل (بندسراتھ کونزیل فیدرائے) کو لیتے ہیں جو سات ممبران یا کونسلروں کی ایک انتظامی جماعت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ فیڈرل کونسل سوئٹزرلینڈ کے ان حکومتی اداروں میں سے ایک ہے جن کا غائر مطالعہ سوئٹزرلینڈ کے وفاقی نظام حکومت کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ موجودہ دور میں کسی جمہوری نظام میں یہ دستور نہیں ہے کہ انتظامی ذمہ داری فرد واحد کی بجائے ایک کونسل کو سونپ دی جائے۔ اور یہ کونسل یا پارٹی ایک با اختیار جماعت ہوتے ہوئے پارٹی پالیٹکس سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ اُن خرابیوں کے سدّباب کیلئے جو ایک ایسی انتظامی جماعت کو دستوراً با اختیار بنانے سے ظہور پذیر ہونی ممکن ہیں، جس کے ہر فرد کا متفق الرائے ہونا ضروری نہیں، امریکہ میں ایک فرد واحد کے ہاتھ میں انتظامی دروبست کی باگ ڈور دیدی گئی۔ اس کے برخلاف سوئٹزرلینڈ میں کسی فرد واحد کو عنان اختیار سونپنا خطرات کا سبب بنتا نظر آیا۔ چنانچہ سوئٹزرلینڈ کے اولین آئین سازوں نے تمام انتظامی طاقت سات آدمیوں کی ایک کونسل کو تفویض کردی۔ اور اس کا نام فیڈرل کونسل رکھا۔

مگر فیڈرل کونسل کابینہ وزارت نہیں ہے۔ برطانیہ میں اور ایسے دیگر ممالک میں جہاں دستوراً کابینہ کا طریق مروج ہے، کابینہ لیجسلیچر کی رہنمائی کرتا ہے اور لیجسلیچر اسے توڑ بھی سکتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی فیڈرل کونسل نہ تو لیجسلیچر کی رہنمائی کرتی ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ لیجسلیچر اسے توڑ دے۔ مگر اس کے ساتھ ہی فیڈرل کونسل سوئٹزرلینڈ کی قومی اسمبلی کے اثر سے کلیتاً آزاد بھی نہیں ہوتی جیسا کہ امریکہ اور دیگر جمہوریتوں میں دستور ہے۔

لاریب سوئٹزرلینڈ کے کانفیڈریشن کا بھی ایک صدر ہوتا ہے مگر جمہوریہ امریکہ یا فرانس کے صدر سے اسکی حیثیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ صدارت کے رسمی فرائض انجام دیتا ہے اور بس۔

جیسا کہ اوپر اشارۃً کہا گیا ہے فیڈرل کونسل سات افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان افراد کو قومی اسمبلی منتخب کرتی ہے۔ ایک کینٹون میں سے از روئے دستور ایک ہی کونسلر لیا جا سکتا ہے۔ فیڈرل کونسل کی ممبری کے دوران میں کونسلر اسمبلی کے کسی ایوان کی نشست کیلئے بطور امیدوار کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اور نہ وہ کوئی عہدہ قبول کر سکتے ہیں۔ ہر کونسلر کو ایک ایک انتظامی شعبہ سپرد کیا جاتا ہے اور وہ اس شعبہ کا ذمہ دار افسر ہوتا ہے مگر کونسل بھی برابر اپنے اجلاس منعقد کرتی رہتی ہے اور ضروری معاملات بحث وتمحیص کے ذریعے طے پاتے رہتے ہیں۔

فیڈرل کونسل کے تمام فیصلے متفقہ ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہر سال جو طویل رپورٹ کونسل کی طرف سے اسمبلی کو پیش کی جاتی ہے، وہ بھی کسی اختلافی نوٹ سے مُبرّا ہوتی ہے۔ کونسلر دونوں ایوانوں میں نشست حاصل نہیں کر سکتے مگر رائے شماری میں شریک ہوئے بغیر وہ دونوں ایوانوں کی کارروائی میں حصہ لیتے ہیں اور اس میں اپنی طرف سے ارکان حکومت کی امداد کرتے ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا مسئلہ زیر غور ہوتا ہے جو فیڈرل کونسل کے کسی خاص شعبے سے متعلق ہو تو اُس شعبے کا ذمہ دار افسر ایوان میں سوالات کے جوابات دیتا ہے اور بحث میں حصہ لیتا ہے۔

فیڈرل کونسل کی مدّت ممبری تین سال ہو گریہ پابندی برائے نام ہی ہو ایک کونسلر مسلسل بہت عرصہ تک کونسلر رہ سکتا ہے۔ از روئے دستور ہر شخص اپنے آپ کو کونسل کی ممبری کے لئے پیش کر سکتا ہے مگر قانونی اور انتظامی ضروریات کے پیش نظر دونوں ایوانوں کے ممبران ہی میں سے کونسلر چُن لئے جاتے ہیں۔ یہ انتخاب اُنکی قوت تقریر یا تدبّر کی وجہ سے نہیں بلکہ انتظامی قابلیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ کونسلر کے لئے پرجوش مقرر یا فصیح البیان خطیب ہونا ضروری نہیں۔ اس میں انتظامی سلیقہ، دماغی شعور، فہم وذکا اور معاملے پر قابو پانے کی صلاحیت وغیرہ باتیں دیکھی جاتی ہیں۔

کونسل کے ممبران میں سے دو ممبروں کو صدر اور نائب صدر بنا لیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب بھی اسمبلی کرتی ہو سبکدوش ہونے والا صدر آئندہ سال کے لئے صدر نہیں بن سکتا۔ رواجاً نائب صدر، صدر کے سبکدوش ہونے کے بعد اس کی کُرسی سنبھال لیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے صدر کے اختیارات کچھ بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف صدارت کے رسمی فرائض انجام دینے کے لئے ہوتا ہے۔ ان فرائض کی انجام دہی کے علاوہ انتظامی اُمور کی نگرانی، اور اندرون وبیرون ملک تمام تقریبات میں ملک کی نمائندگی کرنا بھی اُسی کے سپرد ہوتا ہے۔

دیگر ممبران کی طرح صدر بھی کسی نہ کسی محکمے کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔ بالعموم پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ اس کے ذمے کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اپنا بیشتر وقت اسی کی دیکھ بھال میں صرف کرتا ہے۔ اسے صرف بیس ہزار فرانک سالانہ تنخواہ ملتی ہے جبکہ ہر کونسلر کو اٹھارہ ہزار فرانک سالانہ دیئے جاتے ہیں۔ یہ فرق کچھ زیادہ نہیں۔

عام انتظامی معاملات کے علاوہ فوج، اُمور خارجہ، اور سول سروس وغیرہ کی دیکھ بھال بھی فیڈرل کونسل کے ذمّے ہے۔ جیسا کہ قومی اسمبلی کے بیان میں اوپر کہا جا چکا ہے اُن قوانین کے مسودے بھی فیڈرل کونسل ہی تیار کرتی ہے جو لیجسلیچر کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ جب کبھی خاص غرض کے لئے قانون بنایا جانا منظور ہو جاتا ہے تو فیڈرل کونسل بل بناتی ہے اور اس بل کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ایوان کو اپنا مشورہ بھی پیش کرتی رہتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں ایسی انتظامی عدالتوں کا کوئی وجود نہیں ہے جیسی کہ فرانس اور اٹلی میں ہوتی ہیں۔ اسلئے فیڈرل کونسل جوڈیشل فرائض بھی انجام دیتی ہے۔ افسران کے طرز عمل کے سلسلے میں پیدا ہونے والے ان مقدمات کا بھی جو فیڈرل ٹریبونل کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں کونسل ہی فیصلہ کرتی ہے۔ اس فیصلہ کی اپیل لیجسلیچر میں ہوتی ہے۔

ملکی انتظام سات محکموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ امور خارجہ، امور داخلہ، عدالت اور پولیس، فوج، فنانس، نوکریاں اور ریلوے اور تجارت، صنعت اور زراعت، مختلف کونسلروں کو ان کی قابلیت کا لحاظ کر کے مختلف محکمے سونپ دیئے جاتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے دستور میں یہ درج ہے کہ مختلف محکموں کو مختلف کونسلروں سے مختص کرنا صرف انتظامی سہولت کے لئے ورنہ تمام فیصلوں کا متفقہ ہونا لازمی ہے۔

ہر چند یہ درست ہے کہ فیڈرل کونسل قوانین تیار کرتی اور انھیں اسمبلی کے سامنے رکھتی ہے اور کونسلر دونوں ایوانوں میں شریک ہو کر بغیر رائے دیئے قوانین کے تحفظ میں تقریریں بھی کرتے ہیں مگر جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کونسلر اسمبلی کے ممبر نہیں ہوتے اور نہ کسی خاص پارٹی کے رکن ہو سکتے ہیں۔ اور نہ کسی مخصوص عقیدے یا پروگرام کی حمایت کر سکتے ہیں۔ اگر اسمبلی ان کے پیش کردہ بل نامنظور کر دے تو وہ مستعفی ہونے کا خیال بھی نہیں کرتے۔ بالفاظ دیگر کونسل اسمبلی کی انتظامیہ کمیٹی ہے۔ بنیادی طور پر کونسل بہت محکم ہے۔ مگر اس کا استحکام صرف انتظامی اُمور سلطنت کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پذیر کرنے کے لئے ہے۔ اسمبلی ہر حالت میں کونسل سے بالادست ہے گو قانونی طور پر کونسل اسمبلی کی ملازم ہوتے ہوئے بھی عملاً اسمبلی کی رائے کی تشکیل پر بڑا اثر ڈالتی ہے اور یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ فیڈرل کونسل اسمبلی کی رہنمائی کرتی ہے۔ دستوری اعتبار سے کونسل اسمبلی کی رہبر بھی ہے اور آلۂ کار بھی۔ وہ اکثر ایسے قوانین تجویز کرتی اور ان کا مسودہ بناتی ہے جو اسمبلی بلا پس و پیش منظور کر لیتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسمبلی کونسلوں کے فیصلوں پر خط تنسیخ کھینچ دیتی ہے اور اس کے پیش کردہ

مسودوں میں ترمیمیں کرتی ہے اگر اس سے کونسل کی مقبولیت اور اس کے طرزِ عمل پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا۔ گویا پالیسی کا مرتب کرنا اسمبلی کا کام ہے اور کونسل اپنے علم اور تجربے سے اسمبلی کو پالیسی مرتب کرنے میں مدد دیتی ہے۔

کونسل کا بیشتر کام انتظامی ہے۔ اس میں ایسے ایسے فیڈرل اُمور ہی کا انتظام شامل نہیں ہے جیسے قومی مالیات کا جمع خرچ، یا ریلوے وغیرہ، بلکہ کینٹونوں کی حکومتوں میں فیڈرل قانون کو نافذ کرنا بھی کونسل کے فرائض میں سے ہے۔ یہ مشکل کام بآسانی اس طرح انجام پاجاتا ہے کہ اسمبلی کونسل کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے اور کونسل کے ماتحت نہ صرف فوج ہے بلکہ خزانے پر بھی اس کا قابو ہے اور اگر کینٹونوں میں سے کسی ایک کینٹون کی حکومت اس کے حکم سے سرتابی کرے تو کونسل اس کی مالی امداد روک کر اُسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرسکتی ہے۔

فیڈرل کونسل کی ایک عدیم النظیر خصوصیت یہ ہے کہ کونسل کی رائے ہر معاملے میں متفقہ ہوتی ہے۔ گر اختلاف رائے کلیتاً ممنوع نہیں ہے ایوان میں کونسلر بعض اوقات ایک دوسرے کے مقابل بولتے ہیں لیکن ایسے اختلافات دستوری اعتبار سے کبھی بھی باعث تکلیف نہیں ہوتے۔ کیونکہ جب کبھی انتظامی امور پر اختلاف رونما ہوتا ہے مفاہمت کی راہ نکال لی جاتی ہے یا اس کونسلر کی رائے کے مطابق فیصلہ کرلیا جاتا ہے جس سے وہ خاص طور پر متعلق ہوتے ہیں یا پھر آخری صورت میں فیصلہ اسمبلی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

دستوری اعتبار سے فیڈرل کونسل سوئٹزرلینڈ کے نظام وفاق کی ایک نمایاں کامیابی کی مظہر ہے کیونکہ اس سے تین ایسے فوائد مترتب ہوتے ہیں جو سوئٹزرلینڈ جیسے جمہوری ملک میں جہاں نظام حکومت خود اس ملک کے باشندوں کے ہاتھوں میں ہے، بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

پہلا فایدہ یہ ہے کہ کونسل ایک ایسی جماعت ہے جو حکمراں جماعت اپنے اسمبلی کو مشورہ دے سکتی ہے اور اس کی رائے پر اثر ڈال سکتی ہے۔ اور اس کے باوجود بھی اس کی اس ذمہ داری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی جو باشندگانِ ملک کی طرف سے اس کو سونپی گئی ہے۔ پھر چونکہ اس کا کسی خاص پارٹی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے، یہ وقت ضرورت، مخالف پارٹیوں کے درمیان حَکَم کا کام کرسکتی ہے اور مشکلات پر عبور حاصل کرکے صلح جوئی کی اسپرٹ میں مفاہمت کا راستہ تجویز کرسکتی ہے۔

دوسرا فایدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ مسلّمہ انتظامی قابلیت کے افراد سے زیادہ عرصے تک قوم کی خدمت کا کام لیا جاسکتا ہے خواہ فرداً فرداً مسائل وقت پر اُن کی رائے کچھ بھی ہو۔ اگر فیڈرل کونسل نہ ہو تو اسمبلی کو وزرا کی ایک جماعت رکھنی پڑے۔ اور یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ جماعت ان اصولوں کی موید نہ ہو

جن پر جلکر اسمبلی حکومت کو چلانا پسند کرے۔ ایسی حالت میں یہ یقینی ہے کہ وہ منظور شدہ قوانین سے اظہار ہمدردی نہ کریں گے۔ لیکن فیڈرل کونسل سے اس خطرے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا کیونکہ جب اختلافات بنیادی طور پر اختلافات ہی نہ رہیں تو کونسلر کی حیثیت ایک ایسے نوکر کی حیثیت ہو جاتی ہے جو بہترین طریق پر اپنے کام میں ماہر ہے اور اس کام کا تجربہ رکھتا ہے اور اپنے کام کے احاطے سے باہر اور کسی معاملے کے سلسلے میں اپنے آقا یعنے اسمبلی سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتا۔

تیسرا فایدہ یہ ہے کہ کونسل کے وجود سے ملکی پالیسی میں تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ اور روایات کے قیام کے لئے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ روایات کے استحکام سے ایک یہ خطرہ پیدا ہونا ممکن ہے کہ مبادا نظام حکومت نئی ضروریات کی تکمیل میں قاصر رہ جائے اور نئے طریق کار کو نظر انداز کردے۔ اس خطرے کا سدباب سوئٹزرلینڈ میں اس طرح ہو جاتا ہے کہ وہاں عوام ہر وقت وزراء تک پہونچ سکتے ہیں اور اسمبلی کے ممبران سے بھی ملتے جلتے رہتے ہیں۔

(آیندہ صحبت میں ہم سوئٹزرلینڈ کے وفاقی نظام کے تیسرے اہم عنصر پر روشنی ڈالیں گے)

ڈاکٹر سید جعفری

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ۱۰۰۰ صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً ۱۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:-

مسئلۂ جبر و اختیار — خواب کی حقیقت — معاد و خلود — طبقۂ نسواں اور عزلگوئی — برج بابل — فاسٹ جماعت سامری کون تھا — باغ ارم کی حقیقت — فلسفۂ محبت — بھوت پریت — اصحاب کہف — سالویشن آرمی ہالہ کا سبب — معجزہ و کرامات — فرقۂ معتزلہ — مذہب و عقل — طوفان نوح — یاجوج ماجوج — برہمو سماج طبقۂ نسواں اور تعلیم — مریخ کی حقیقت — منصور حلاج — چند الفاظ کی تحقیق — اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ — قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے للعہ — غیر خریداران سے ۳؎

منیجر نگار لکھنؤ

ایک "مزہک" اور دو افسر

ایک زمانہ میں دو افسر تھے جو اتنے خالی الدماغ تھے کہ ایک دن وہ یکایک ایک غیر آباد جزیرہ میں اس طرح پہونچ گئے کہ گویا وہ جادو کے قالین پر بیٹھ کر آ گئے ہوں۔

ان کی تمام زندگی ایک ایسے سرکاری محکمہ میں گزری تھی جہاں ریکارڈ رکھے جاتے تھے۔ وہ دونوں وہیں پلے، وہیں ان کی پرداخت ہوئی، وہیں بڑھے ہوئے اور اسی وجہ سے اس محکمہ کے باہر کسی چیز کے بارے میں بھی وہ مطلق نہ جانتے تھے اور جو الفاظ ان کو معلوم تھے وہ حسب ذیل تھے:۔ "آپ کی پوری عزت کا یقین دلاتے ہوئے، میں ہوں آپ کا ادنیٰ خادم"۔

لیکن محکمہ تخفیف میں آ گیا اور چونکہ ان دونوں کی خدمات کی اب ضرورت باقی نہ رہ گئی تھی، اس لئے ان کو آزادی دیدی گئی۔ اس کے بعد یہ دونوں افسر سینٹ پٹرسبرگ کی پوڈیا چسکیا اسٹریٹ میں اقامت گزیں ہو گئے ہر ایک کا الگ مکان، الگ ملازم اور علحدہ پنشن تھی۔

بہر حال، اُس غیر آباد جزیرہ میں جب ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ دونوں کے دونوں ایک ہی چھت کے نیچے لیٹے ہیں۔ پہلے تو ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا اور آپس میں اس طرح گفتگو کرتے رہے جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہوئی ہو۔

"یور اکسلنسی۔ رات کو میں نے بھی کیا عجیب خواب دیکھا ہے"۔ ایک افسر نے کہا۔ "ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ایک غیر آباد جزیرہ میں آ گیا ہوں"۔

وہ یہ الفاظ اچھی طرح سے کہنے بھی نہ پایا تھا کہ یکایک اُچھل پڑا۔ دوسرا افسر بھی اسی طرح گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "ارے غضب، یہ سب کیا ہے کیا؟ ہم ہیں کہاں؟" وہ دونوں نہایت استعجاب کے عالم میں چلانے لگے۔

انھوں نے ایک دوسرے کو چھوا تا کہ یہ یقین ہو جائے کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہے ہیں اور پھر اس تلخ حقیقت کا انھیں یقین کرنا ہی پڑا۔

اُن کے سامنے سمندر لہریں مار رہا تھا اور ان کی پشت پر زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جس کے بعد

پھر سمندر ہی سمندر تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ رونے لگے ۔۔۔ اپنے محکمہ کی تخفیف میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ!۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور انھیں یہ محسوس ہوا کہ دونوں اپنی شب خوابی کی قمیص کے علاوہ اور کچھ نہیں پہنے ہیں البتہ ان کا تمغہ ضرور گلے میں لٹک رہا ہے۔

"اب اسوقت کافی آجانا چاہیئے" ایک افسر نے کہا۔ مگر اسے پھر اپنی حالت کا خیال آگیا اور رونے لگا۔

"اب ہم کریں تو کیا کریں" اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ بھی فرض کرلیں کہ ہمیں ایک رپورٹ تیار کرنا ہے تو بھی ہم کو اس سے کیا فایدہ ہوگا؟"

"اب آپ سب کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ یور اکسلنسی"۔ دوسرے افسر نے جواب دیا۔ "آپ مشرق کی طرف جائیے اور میں مغرب کی سمت جاؤں گا۔ شام کے وقت ہم لوگ پھر یہیں ملیں گے اور ممکن ہے کہ اس درمیان میں کسی بات کا پتہ چل جائے"۔

چنانچہ پہلے تو انھوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ مشرق کدھر ہے اور مغرب کدھر۔ پھر انھیں خیال آیا کہ ان کے محکمہ کے افسر اعلیٰ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "اگر تمھیں یہ جاننا ہے کہ مشرق کس طرف ہے تو اپنا منھ شمال کی سمت کرلو۔ اور مشرق تمھارے داہنے طرف ہوگا" مگر جب انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ شمال کدھر ہے تو وہ داہنی طرف بھی گھومے، بائیں طرف بھی اور چاروں طرف دیکھا بھی۔ مگر زندگی بھر تو ریکارڈ کے محکمہ میں رہے تھے ان کی یہ تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔

"یور اکسلنسی! میرے خیال میں تو بہتر یہ ہوگا کہ آپ داہنی طرف جائیے اور میں بائیں طرف" ایک افسر نے کہا جس نے نہ صرف ریکارڈ کے محکمہ میں کام کیا تھا بلکہ اسکول میں خوشنویسی کا اُستاد بھی رہ چکا تھا اور اسی وجہ سے کچھ زیادہ ہوشیار بھی تھا۔

خیر۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ ایک افسر اپنے دلہنے سمت چلا۔ چلتے چلتے وہ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہونچا جن میں ہر قسم کے پھل لگے تھے۔ وہ ایک امرود ضرور توڑ لیتا، مگر وہ اتنے اونچے تھے کہ اسے اوپر چڑھنا ہوتا۔ اُس نے چڑھنے کی کوشش کی مگر بے سود اور ملایہ کہ اُس کی قمیص بھی پھٹ گئی۔ اس کے بعد وہ ایک چشمہ کے پاس پہونچا۔ اس میں مچھلیاں کثرت سے تھیں۔

"کیا عمدہ بات ہوتی اگر یہ تمام مچھلیاں ہمارے پاس پوڈیا چسکیا اسٹریٹ میں ہوتیں" اُس نے خیال کیا اور اس خیال کے آتے ہی اُس کے منھ میں پانی بھر آیا۔ پھر وہ جنگل میں داخل ہوا اور یہاں اُسے تیتر، جنگلی مرغ اور خرگوش دکھائی پڑے۔

"ارے اللہ۔ اس قدر افراط سے کھانا" اُس کو بھوک شدت سے لگ رہی تھی۔ لیکن آخرکار

اُسے خالی ہاتھ واپس ہونا پڑا۔ دوسرا افسر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

”یور اکسلنسی۔ فرمائیے۔ کیسی۔ بنی۔ کچھ ملا؟“

”ماسکو گزٹ کے ایک پرانے نمبر کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔“

دونوں افسر سونے لیٹ گئے مگر ان کے خالی پیٹوں کی بدولت انھیں آرام نہ ملا۔ ان کی نیند کچھ تو اس خیال سے دور بھاگ رہی تھی کہ اب ان کی پنشن سے کون مزہ اُڑا رہا ہوگا اور کچھ ان پھلوں، مچھلیوں، تیتروں، مرغوں، اور خرگوش کے خیال سے جنھیں دونوں نے جنگل میں دیکھا تھا۔

”غذائے انسانی اپنی اولین صورت میں اُڑتی ہے، تیرتی ہے اور درختوں پر اُگتی ہے۔ بھلا کس کو یہ خیال ہو سکتا تھا۔ یور اکسلنسی“ ایک افسر نے کہا۔

”یقیناً“ دوسرے نے جواب دیا۔ ”اس کا تو میں بھی اقرار کرتا ہوں کہ مجھے بھی یہی خیال ہوتا تھا کہ ہمارا ناشتہ دنیا میں ٹھیک اُسی طرح نازل ہوتا ہے جیسا وہ ہمارے سامنے میز پر آتا ہے۔“

”تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر ہمیں تیتر کھانا ہے تو ہمیں پہلے اُسے پکڑنا چاہئے، اُسے مارنا چاہئے، اُسکے پر نوچنا چاہئیں اور پھر اُسے بھوننا چاہئے۔ مگر یہ ہو تو کیسے ہو؟“

”ہاں۔ یہ کیسے ہو“۔ دوسرے افسر نے بھی کہا۔

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے اور کوشش کی کہ سو رہیں مگر بھوک ان کی نیند کو دور بھگا رہی تھی انکی آنکھوں کے سامنے تیتروں اور بطخوں کے جھنڈ اور سور کے گلّے آ رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کے سب نہایت چربیلے اور زیتون وغیرہ میں تیار کی ہوئی غذائیں ہیں۔

”مجھے تو اتنی بھوک لگی ہے کہ اپنا جوتہ بھی کھا سکتا ہوں“ ایک افسر نے کہا۔

”دستانے بھی بُرے نہیں ہیں خصوصاً جب وہ نرم نرم ہوں“ دوسرے افسر نے کہا

دونوں افسر ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے مصیبت کی پیشینگوئی کرنے والی چنگاریاں نکل رہی تھیں، ان کے دانت کٹکٹا رہے تھے اور ان کے سینوں سے آہیں نکل رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور یکایک ان میں وحشت پیدا ہو گئی۔ یکایک غرانے کی آواز آئی، اور جو افسر خوشنویسی کا اُستاد رہ چکا تھا اُس نے اپنے ساتھی کا تمغہ کاٹ کر چبا لیا۔ مگر خون دیکھتے ہی ان کے ہوش و حواس پھر درست ہو گئے۔

”خدا خیر کرے“۔ انھوں نے بیک وقت نہایت گھبراہٹ میں کہا۔ ”کیا ہم ایک دوسرے کو کھا جانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یہ آخر ہم کو ہو کیا گیا ہے، کونسی بلا ہم لوگوں پر مسلط ہو گئی؟“

اچھا تو اب ہم کو وقت کاٹنے کے لئے کوئی دلچسپ گفتگو کرنا چاہئے ورنہ اندیشہ ہے کہ کوئی واردات قتل کی نہ ہو جائے" ایک افسر نے کہا۔

دوسرے نے جواب دیا "اچھا آپ شروع کیجئے"۔

اس نے کہا:۔ "کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ سورج پہلے طلوع ہوتا ہے اور بعد کو غروب۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کے برعکس کیوں نہیں ہوتا"۔

"آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ یور اکسلنسی۔ آپ پہلے بیدار ہوتے ہیں، پھر دفتر جاتے ہیں، وہاں کام کرتے ہیں اور رات کو سونے کے لئے لیٹتے ہیں"۔

"لیکن اس کے برخلاف کیوں نہ فرض کیا جائے یعنی یہ کہ ایک شخص پہلے سوتا ہے، سونے کی حالت میں ہر قسم کے خواب اور شکلیں دکھائی پڑتی ہیں اور اس کے بعد بیدار ہوتا ہے"۔

"ہاں خیر۔ لیکن جب میں افسر تھا تو میں ہمیشہ یہ خیال کرتا تھا:۔ اب صبح ہوئی ہے۔ پھر دن ہوگا۔ پھر رات کے کھانے کا وقت آئے گا اور پھر سونے کا وقت آجائے گا"۔

"رات کے کھانے" کے الفاظ نے دن کی سرگرمیاں دونوں کو یاد دلا دیں اور اس خیال نے دونوں افسروں کو افسردہ کر دیا جس سے گفتگو رک گئی۔

"ایک ڈاکٹر نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ انسان صرف اپنے جسم کے عرق پر عرصہ تک زندہ رہ سکتا ہے" ایک افسر نے کہا

"اس کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ تو بالکل آسان ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کی ذاتی رطوبتیں، دوسری رطوبتیں پیدا کرتی ہیں اور یہ تیسری، پھر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ سب عرق ختم ہو جاتے ہیں"۔

"پھر کیا ہوتا ہے"

"اس کے بعد پھر غذا پہونچنا ضروری ہوتی ہے"۔

"لاحول ولا۔۔۔۔"

غرضکہ دونوں افسر جس موضوع پر بھی گفتگو کرتے تھے سلسلۂ کلام کھانے پر جا کر ختم ہوتا تھا جس سے ان کی بھوک میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا چنانچہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ گفتگو کا سلسلہ ہی ختم کر دیا جائے۔ اتنے میں انھیں "ماسکو گزٹ" کا خیال آیا جو ایک افسر کو مل گیا تھا اور دونوں نے اسے اٹھا کر نہایت اشتیاق سے پڑھنا شروع کیا۔

"میئر کی دعوت"

"سو آدمی کھانے پر مدعو کیے گئے تھے۔ دعوت اتنے شاندار پیمانہ پر تھی کہ اس کا خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ دیوتاؤں کی اس دعوت میں مختلف صوبوں کی نمایندگی بیش بہا تحائف سے کی گئی تھی۔ شکسنا کی سنہری مچھلی، قاف کے جنگلوں کا نقرئی تیتر اور ماسٹر ابری وغیرہ نے مل کر ایسا دلچسپ سامان مہیا کیا تھا کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے...."

"بدمعاش! خدا کے لئے پڑھنا بند کر دیجئے۔ یور اکسلنسی۔ کیا آپ کو اور کچھ نہیں پڑھنے کو ملتا تھا؟" دوسرے افسر نے نہایت ناامیدی کی حالت میں ان سے کہا۔ اُس نے اپنے ساتھی کے ہاتھ سے اخبار چھین کر کچھ اور پڑھنا شروع کیا۔

"ہمارا نامہ نگار مقیم تولا ہم کو مطلع کرتا ہے کہ اوپا میں ایک اسٹرجن مچھلی پائی گئی ہے (یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو یہاں کے بڈھے سے بڈھے لوگوں کو بھی نہیں یاد ہے اور سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ انھوں نے اس اسٹرجن میں اپنے سابقہ پولیس افسر کو پہچانا) چنانچہ اس چیز کے اعزاز میں کلب میں ایک دعوت دی گئی۔ دعوت کی خاص چیز لکڑی کی ایک کشتی میں جس کے چاروں طرف اچار اور مربے وغیرہ رکھے ہوئے تھے پیش کی گئی۔ ڈاکٹر پی — جو کھلانے کے مہتمم (ٹوسٹ ماسٹر) تھے ایسا انتظام کیا تھا کہ ہر شخص کو اسٹرجن کا ایک ٹکڑا ضرور مل جائے۔ اُس کے ساتھ مختلف قسم کی اور بہت لذیذ چٹنیاں —"

"معاف کیجئے گا۔ یور اکسلنسی۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی پڑھنے والی عبارت کے انتخاب میں کچھ ملکہ نہیں ہے" پہلے افسر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا اور خود گزٹ لیکر پھر پڑھنا شروع کیا۔

"ویاٹکا کے ایک بہت بوڑھے آدمی نے مچھلی کے شوربہ کے لئے ایک تازہ اور بالکل نئے نسخہ کی تحقیق کی ہے۔ ایک زندہ (کاڈ فش) مچھلی لی جاتی ہے اور اس کو ایک ڈنڈے سے اتنا پیٹا جاتا ہے کہ اُس کا جگر غصہ سے پھول جاتا ہے...."

افسروں کا سر جھک گیا۔ جس چیز پر ان کی نظریں پڑتی تھیں۔ ان کا کچھ نہ کچھ کھانے سے تعلق ضرور ہوتا تھا۔ انھوں نے کھانے کی چیزوں کو اپنے دماغ سے بہت دور رکھنے کی کوشش کی مگر سب بیکار۔ ان کے خیالات کسی مقناطیسی قوت کی وجہ سے گھوم گھام کر پھر اُسی چیز پر مجتمع ہو جاتے تھے جس کے لئے وہ اسقدر بیتاب تھے۔

یکایک اُس افسر کو جس نے ایک زمانہ میں خوشنویسی سکھائی تھی ایک الہام ہوا:—

"وہ مارا"۔ اُس نے نہایت مسرت کے لہجہ میں پکار کر کہا۔ "کہئے آپ کا اس بارہ میں کیا خیال ہے؟

یور اکسلنسی ـــــ اگر ہم لوگ کسی "مزہک"[1] کو ڈھونڈھ لائیں تو آپ کی کیا رائے ہے۔

"مزہک! یور اکسلنسی، کس قسم کا "مزہک"؟"

"ارے بھئی۔ یہی معمولی "مزہک"، ویسا ہی "مزہک" جیسے سب 'مزہک' ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے ناشتہ بھی لے آئے گا اور تیتر اور مچھلیاں بھی۔

"ہوں مزہک! لیکن اگر یہاں کوئی مزہک نہ ہوا تو کہاں سے لائیں گے؟"

"کیوں صاحب۔ کیوں نہ ہوگا۔ مزہک ہر جگہ ہوتے ہیں۔ صرف ان کی تلاش شرط ہے۔ یہاں بھی کہیں نہ کہیں ضرور چھپا ہوا ہوگا تاکہ اُسے کام نہ کرنا پڑے۔"

اس خیال نے دونوں افسروں کو اتنا مسرور کر دیا کہ وہ مزہک کی تلاش کے لئے فوراً تیار ہو گئے۔ عرصہ تک وہ جزیرہ میں مقصود دلی حاصل کئے بغیر یونہیں گھومتے رہے لیکن کچھ دیر کے بعد کالی روٹی اور بھیڑ کی کھال کی خوشبو ان کی ناک میں آنے لگی اور دونوں اسی خوشبو کی سمت چلنے لگے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد درخت کے نیچے ایک مزہک نظر آیا جو اپنے سر کے نیچے ہاتھ رکھے سو رہا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ محض کام سے بچنے کے لئے وہ اس جزیرہ میں بھاگ آیا تھا چنانچہ اس پر افسروں کے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔

"کیوں یہاں سو رہا ہے۔ کاہل کہیں کا!" دونوں افسر بگڑ کر کہنے لگے۔ "کیا تجھے اتنا بھی نہیں خیال ہے کہ یہاں دو افسر بھوک کے مارے مرے جا رہے ہیں۔ اُٹھ۔ کھڑا ہو۔ چل کام کر۔" مزہک کھڑا ہو گیا اور ان دو آدمیوں کی طرف دیکھا جو اُس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے اُس کو خیال ہوا کہ وہ بھاگ جائے مگر افسروں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اُسے اپنی قسمت کے آگے سر جھکانا اور کام کرنا پڑا۔

پہلے تو وہ ایک درخت پر چڑھا اور افسروں کے لئے کئی درجن عمدہ امرود توڑے اور ایک سڑا ہوا سا اپنے لئے لے لیا۔ اس کے بعد اُس نے زمین کھودی اور کچھ آلو نکالے۔ پھر اُس نے لکڑی کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے گھس کر آگ بنائی۔ اپنے بالوں کا اُس نے جال بنایا اور اُس سے تیتر پکڑے۔ اور اس آگ پر جو اب خوب جلنے لگی تھی اُس نے اتنے اقسام کے کھانے پکائے کہ افسروں کے دلوں میں یہ خیال آنے لگا کہ اس کاہل کو بھی کچھ دینا چاہئے۔

مزہک کی کوششوں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ اس سے قبل دن میں وہ کس قدر بھوکے تھے۔ اب ان کے دل میں صرف یہ خیال تھا! افسر ہونا بھی کیا عمدہ چیز ہے کسی افسر پر کبھی کوئی مصیبت نہیں پڑ سکتی۔

---

[1] ایک ایسا ملازم جسکے سپرد تمام خدمتیں ہوتی ہیں۔

"اب آپ لوگوں کو اطمینان ہوا؟" مزہک نے دریافت کیا۔

"ہاں۔ ہم تمھاری محنت کی داد دیتے ہیں" افسروں نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ مجھے تھوڑی دیر آرام کر لینے کی اجازت دیجئے گا؟"

"ہاں جاؤ، کچھ آرام کر لو مگر پہلے ایک مضبوط رسی بنا دو"

مزہک نے پٹادر کے گٹھے اٹھائے، ان کو پانی میں ڈالا، انھیں پیٹا، توڑا اور شام کو ایک نہایت عمدہ مضبوط رسی تیار کر دی۔ افسروں نے رسی لیکر مزہک کو ایک درخت سے باندھ دیا تاکہ وہ کہیں بھاگ نہ سکے اور پھر خود سو گئے۔

اسی طرح کئی روز گزر گئے اور مزہک اتنا ہوشیار ہو گیا کہ وہ افسروں کے لئے شوربہ بھی تیار کرنے لگا۔ ادھر دونوں افسر کھا کھا کر خوب مگن رہنے لگے ان کو اس بات کی اور خوشی ہوتی تھی کہ یہاں انھیں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا ہے اور سینٹ پیٹرسبرگ میں ان کی پنشنیں جمع ہو رہی ہیں۔

"آپ کی کیا رائے ہے، یور اکسلنسی!" ایک دن ناشتہ کے بعد ایک افسر نے دوسرے سے کہا۔ "کیا منارۂ بابل کا قصہ سچا ہے؟۔ کیا آپ کا یہ خیال نہیں ہے کہ یہ محض ایک استعارہ ہے؟"

"کبھی نہیں۔ یور اکسلنسی! میرے خیال میں یہ واقعہ تھا۔ دنیا میں اتنی زبانوں کے وجود کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"تو سیلاب بھی آیا ہو گا؟"

"یقیناً۔ ورنہ پھر قبل سیلاب کے جانوروں کے وجود کی تشریح کیونکر کیجئے گا۔ اس کے علاوہ "ماسکو گزٹ" لکھتا ہے ــــ" انھوں نے ماسکو گزٹ کے اسی پرانے نمبر کو پھر تلاش کیا اور سایہ میں بیٹھ کر اس کو شروع سے لیکر آخر تک پڑھ ڈالا۔ انھوں نے ماسکو، ٹولا، پنزا، اور ریازن کی دعوتوں کا تذکرہ بھی پڑھا اور تعجب ہے کہ اطعمۂ لذیذہ کے بیان پر ان کو کچھ بھی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ زندگی کتنے عرصہ تک بسر ہوتی۔ لیکن انجام کار اب افسروں کے لئے وہ وبال جان ثابت ہونے لگی۔ وہ اکثر سینٹ پیٹرسبرگ میں اپنے باورچی کا خیال کرتے اور تنہائی میں دو آنسو بھی بہا لیتے۔

"معلوم نہیں۔ پوڈیا چسکیا اسٹریٹ میں کیا ہو رہا ہو گا، یور اکسلنسی" ایک افسر نے کہا۔

"اب اس کی یاد نہ دلائیے۔ یور اکسلنسی۔ مجھے تو گھر کا خیال مارے ڈالتا ہے"

"ہے تو یہ جگہ بہت اچھی مگر بھیڑ کے بچہ کو اپنی ماں کے پاس جانے کی خواہش ضرور ہوتی ہے اور ان خوبصورت یونیفارموں کا خیال بھی رنجدہ ہے"

"ہاں - یہ تو واقعہ ہے یہ چوتھے درجہ کا یونیفارم مذاق نہیں ہے - اُس میں سنہری کارچوبی کا کام ہی ایسا ہے کہ آدمی کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں"

اب یہ دونوں مزہک کا اس پر ناطقہ بند کرنے لگے کہ ہم کو پوڈیا چسکیا اسٹریٹ پھر واپس لے چل اور حیرت یہ کہ مزہک پوڈیا چسکیا اسٹریٹ سے واقف بھی تھا - ایک مرتبہ اُس نے وہاں شراب بھی پی تھی مگر جیسا کہ مشہور ہے اُس کے منھ میں کچھ نہ گیا البتہ داڑھی کی طرف سے سب بہہ گیا - بہرحال افسر خوش ہو گئے اور کہنے لگے "ہم دونوں پوڈچسکیا اسٹریٹ کے رہنے والے افسر ہیں"

"اور میں ان میں سے ہوں — آپ کو یاد ہے؟ — جو چوبان پر بیٹھتے ہیں اور باہر کی دیواروں پہ صفیدی پھیرتے ہیں - میں ان میں سے ہوں جو چھتوں پر مکھیوں کی طرح چلتے ہیں" مزہک نے جواب دیا -

اب مزہک اس فکر میں پڑ گیا کہ اپنے افسروں کو جو اُس کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتے رہے ہیں اور اُس کے کام کو کبھی بُرا نہیں کہا - اور زیادہ کیونکر خوش کر سکتا ہے - چنانچہ اُس نے حقیقت میں ایک جہاز بھی تیار کر لیا اگرچہ وہ صحیح معنی میں جہاز نہ تھا مگر کم از کم ایک ایسی کشتی تھی جو انھیں سمندر سے نکال کر پوڈیا چسکیا اسٹریٹ تک پہونچا دے -

"دیکھ بے - کتے! ہوشیار رہنا - کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کو تو گرادے" افسروں نے کہا جب کہ انھوں نے کشتی کو لہروں پر تھپیڑے کھاتے دیکھا -

"ڈرئے نہیں - ہم مزہکوں کو اس کا بہت تجربہ ہے" مزہک نے سفر کے سامان کی تیاری کرتے ہوئے جواب دیا - اُس نے اونی کپڑا جمع کر کے اپنے افسروں کے لئے دو نشستیں بنائیں اور خود بھی بیٹھ کر کشتی چلانا شروع کر دی -

راستہ میں دونوں افسر کتنے خوفزدہ رہے، طوفانوں میں وہ کتنے بیمار رہے، اور مزہک کو اُس کی کاہلی پر انھوں نے کس کس طرح ڈانٹا، یہ سب نہ تو کہا جا سکتا ہے نہ لکھا - مزہک راستہ بھر کھیتا رہا اور اپنے افسروں کو مچھلیاں کھلاتا رہا - آخر کار انھیں نیوا دکھائی پڑی - پھر نہر کیتھرائن پہونچے یہاں تک کہ پوڈیا چسکیا اسٹریٹ بھی آ گئی! جب باورچیوں نے اپنے افسروں کو ایسا موٹا تازہ اور خوش و خرم دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے -

افسروں نے 'کافی پی' رول کھایا اور پھر اپنے یونیفارم پہن کر پنشن کے دفتر گئے - اس دوران میں انھوں نے کتنا روپیہ جمع کر لیا تھا یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا - مگر مزہک فراموش نہیں کر دیا گیا - افسروں نے اُسے بھی وسکی کا ایک گلاس اور پانچ کوپک بھیجے!

اب کیا ہے — خوشی مناؤ میاں مزہک!

(روسی افسانہ)

جاپان کا مسئلہ آبادی

تازہ مردم شماری ۳۶-۱۹۳۵ء کی رو سے جاپان کی آبادی دس کرور سے زاید ہے۔ یہ آبادی دو لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر ہم سترہ لاکھ ایکڑ زمین کو جو قابل سکونت و زراعت ہے مدنظر رکھ کر فی مربع میل اوسط آبادی معلوم کریں، تو ۲۷۴۳ ہوتا ہے۔ لیکن اگر مجموعی رقبہ کا لحاظ کیا جائے تو ۴۰۶ فی مربع میل ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال جاپان کی آبادی میں تقریباً دس لاکھ نفوس کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور ۱۸۶۸ء سے اب تک آبادی تقریباً سہ چند ہو گئی ہے۔

۱۸۶۸ء سے قبل آبادی صرف تین کرور تھی۔ اور ایک عرصۂ دراز تک اُسمیں کسی کمی یا بیشی کے آثار نہ پائے جاتے تھے، یعنی رفتارِ پیدائش تو کافی تھی لیکن اُس کے مقابلہ میں متضاد طاقتیں بھی کارفرما رہیں جنکی وجہ سے آبادی بڑھنے نہ پائی۔ مثلاً قحط۔ بیماریاں اور نقل و حرکت کے ذرائع کی کمی۔ ان کے علاوہ بعض معاشری رسوبات مثلاً یہ کہ بڑے کنبے کو بُرا سمجھا جاتا تھا اور پانچ میں سے دو بچے ضرور قتل کردئے جاتے تھے۔ پھر جسمانی سزائیں بھی اُس زمانہ میں مروج تھیں جن کے خوف سے لوگوں کو آیندہ بچے پیدا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ۱۸۶۸ء سے ۱۸۳۰ء کے درمیان آبادی تین کرور سے چھ کرور ہو گئی۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں آٹھ کرور تیس لاکھ اور ۳۶-۱۹۳۵ء میں دس کرور سے زاید!

ملکی وسائل کی بیچارگی

اب اس بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ اس پر غور کیجئے کہ ملک تمام آبادی کو خوراک بہم پہونچانے کے قابل ہے یا نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں پیداوار ہر سال بڑھ رہی ہے لیکن اُس نسبت سے نہیں جس نسبت سے آبادی بڑھ رہی ہے علاوہ اسکے معیار زندگی بلند ہونے کی وجہ سے مصارف خوراک بھی زیادہ ہو رہے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ جاپانیوں کی خوراک بھی مخصوص ہے یعنی وہ سوائے جاپانی چاولوں اور مچھلی کے کچھ نہیں کھا سکتے۔ کوشش کی گئی تھی کہ باہر سے چاول منگوائے جائیں لیکن جاپانی اُن کو "خارجی چاول" کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپانی چاولوں کی قیمت ہمیشہ غیر متعین اور غیر یقینی رہتی ہے یعنی

اگر فصل اچھی ہو گئی تو جاپان سے باہر چاولوں کی کوئی منڈی موجود نہیں جہاں زائد از ضرورت غلہ کھپایا جا سکے اور اگر فصل خراب ہوئی تو مزید رسد مہیا نہیں ہوتی۔ آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے چاولوں کا مطالبہ روز بروز بڑھ رہا ہے لیکن رقبہ زیر کاشت اُسی نسبت سے ترقی نہیں پاتا۔ اس کی کچھ وجہ تو زمینداروں کی غربت ہے جو مزید سرمایہ اس مد میں نہیں لگا سکتے اور کچھ یہ کہ آلات کے پرانے ہونے کی وجہ سے کاشت کے مصارف بھی زیادہ پڑتے ہیں۔ اسی لئے چاولوں کی قیمت وہاں بڑھ رہی ہے جس نے موجودہ صورتِ حال کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ چونکہ جاپانیوں کی مرغوب غذا صرف چاول ہے۔ اس لئے زمینداروں کا زیادہ تر سرمایہ اسی کی کاشت میں صرف ہو رہا ہے۔ اور دوسرے غلوں کی پیداوار روز بروز کم ہو رہی ہے مثلاً باجرہ پہلے سے کم پیدا ہونے لگا ہے، گیہوں کی پیداوار اگرچہ برطانوی اثر کے ماتحت بڑھ گئی ہے لیکن کما حقہٗ نہیں۔ اس لئے اب سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ معیارِ زندگی قائم رکھنا ہے تو وسائلِ ملکی کا بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ تطابق کس طرح کیا جائے؟

اس کے دو ہی طریق ہیں۔ یا تو آبادی کو آئندہ بڑھنے سے روک دیا جائے اور یا جاپان اپنے جذبۂ خود پرستی کو خیرباد کہے اور باہر سے اپنی غذا فراہم کرے۔

افزائشِ نسل کے محرکات

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا پہلا طریق قابلِ عمل ہے یا نہیں؟ اس کے لئے حسبِ ذیل محرکات کا مطالعہ کرنا ہو گا جو افزائشِ نسل کا باعث ہیں۔

میں نے ایک گزشتہ مضمون میں واضح کیا تھا کہ جاپان کا معاشری نظام کنبہ پروری اور صغر سنی کی شادی وغیرہ کی حمایت کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کو زیادہ بچے پیدا کرنے کی ترغیب و تحریص ہوتی ہے۔ کیونکہ اولاد صرف اُس صورت میں پیدا کی جا سکتی ہے جب ملک میں جان و مال کی حفاظت کا انتظام ہو۔ دوسرے ماں باپ کو علم ہو کہ اُن کے بچوں کی پرورش کا بار اُن پر نہیں پڑے گا۔ یورپ میں چونکہ نفسی نفسی کا اُصول کارفرما ہے یعنی ہر شخص اپنی روزی اور کمائی وغیرہ کا خود ذمہ دار ہے اس لئے وہاں اولاد زیادہ پیدا کرنے کی کسی کو خواہش نہیں ہوتی۔ لیکن مشرق میں چونکہ بچوں کی رکھوالی کی ذمہ دار قوم سمجھی جاتی ہے اور یوں بھی اشتراکِ خاندانی کی وجہ سے یتیم بچوں اور بیواؤں وغیرہ کی پرورش اور حفاظت مجموعی طور پر ہوتی ہے اس لئے کسی کو سامانِ خورد و نوش وغیرہ کی طرف سے کوئی فکر نہیں ہوتی۔ پس جاپان میں بھی اس جذبۂ اجتماعیت کی وجہ سے افزائشِ نسل کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا جاتا اور وہاں کی رفتارِ پیدائش روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اشتراکِ خاندانی کے ساتھ ساتھ وہ بندشیں اور روکاوٹیں بھی دور ہو رہی ہیں جو اس سے قبل افزائشِ نسل کے راستہ میں حائل تھیں۔ مثلاً اب بدنی سزائیں

رواج پذیر نہیں رہیں۔ توہم پرستی بہت حد تک دور ہو گئی ہے اور کثرت اولاد قومی ترقی کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہے۔ بیماریاں اور قحط زدگیاں بھی کم ہو گئی ہیں۔ ذرائع نقل و حرکت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اس لئے آبادی بڑھ رہی ہے۔

۳۔ جاپان میں تجرد ممنوع ہے۔ شادی ایک مذہبی فریضہ متصور ہوتا ہے اور جو نوجوان شادی شدہ نہ ہوں اُن کو گھر کے لئے فالِ بد سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ جاپان میں عورت کی حیثیت بہت ذلیل ہے اور اُسے اولاد پیدا کرنے کی ایک مشین خیال کیا جاتا ہے۔

۵۔ "ضبطِ تولید" اور "مانع حمل" کے اُصول جاپان میں مروج نہیں ہیں بلکہ اُن کو بُرا خیال کیا جاتا ہے کیونکہ جاپانی گورنمنٹ کے نزدیک سیاسی ضروریات زیادہ آبادی کی مقتضی ہیں۔

الغرض جاپان کی افزائش نسل کے ذمہ دار وہاں کے مذہبی، معاشری، و سیاسی حالات ہیں۔ اور جب تک اُن میں انقلاب پیدا نہ ہو، موجودہ آبادی میں کسی قسم کی کمی کی اُمید رکھنا عبث ہے۔

جہاں تک سیاسی حالات کا تعلق ہے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جاپان اپنی پالیسی میں حق بجانب ہے کیونکہ ایک طرف تو اُسے روس کی بے پناہ یلغار سے خطرہ ہے اور دوسری طرف چینی حملہ کی مدافعت کرنی ہے۔ پھر اُسکے چاروں طرف سمندر ہے جس سے فائدہ اُٹھانے کی جملہ اقوام دعویدار ہیں ایک طرف امریکہ اپنے حقوق جتانا چاہتا ہے تو دوسری طرف برطانیہ عظمیٰ اپنی فوج وہاں رکھنا چاہتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر جاپان کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ مدافعین کی ایک بڑی جماعت اپنے ملک میں تیار کرے۔

مذہبی و معاشری رسوم بدل دینا بھی قرینِ مصلحت نہیں کیونکہ جاپان نے اپنے معاشری نظام سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے مثلاً اُس کو امداد باہمی۔ ساہوکارہ اور بیمہ وغیرہ کے علیحدہ ادارے قائم نہیں کرنے پڑے کیونکہ ان سب کا کام جاپانی اپنے اشتراکِ خاندانی سے لے لیتا ہے۔ پس اگر وہ خاندان کی بندھنیں توڑنے کو رواج دیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ مالی لحاظ سے جاپان پر بہت بار پڑ جائے گا۔ ماہرینِ اقتصادیات نے وہاں تین ذرائع تجویز کئے ہیں جن سے یہ اقتصادی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں:۔

۱۔ خوراک میں تبدیلی۔

۲۔ ہجرت ——— ۳۔ صناعت و تجارت کی مزید ترقی۔

خوراک کی تبدیلی اسوقت جاپان کی تنہا مرغوب غذا چاول ہے جس کا مستقبل امید افزا نہیں۔ اس لئے مناسب یہی خیال کیا جاتا ہے کہ جاپانی اپنی غذا کو تبدیل کر دیں تاکہ باہر سے غلہ بھی درآمد

کیا جاسکے اور آبادی کا زیادہ حصہ اس پر زندگی بسر کرے۔ لیکن غذا کو تبدیل کرنے کے لئے نہایت زبردست پروپگنڈے کی ضرورت ہے اور جب تک ملک میں عملی تجارت نہ کی جائیں اس باب میں کسی کامیابی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ البتہ سمندر سے کافی فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے اور اس طرح ماہی گیری کو فروغ دیا جائے آج کل ماہی گیری عام کشتیوں میں بیٹھ کر کی جاتی ہے لیکن اگر پٹرول یا کوئلہ سے کام لیا جائے تو یہ بہت فروغ پاسکتی ہے۔ آج کل تقریباً تیرہ لاکھ آدمی اس کاروبار میں لگے ہوئے ہیں کام کرنے کا طریق پرانا اور غیر منظم ہے اگر ان نقائص کو دور کر دیا جائے تو بہت کچھ ترقی کی اُمید ہوسکتی ہے۔

ہجرت آبادی کا دباؤ کم کرنے کے لئے ہجرت کی تحریک کی گئی تھی لیکن اول تو اس باب میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ بوجہ جذبۂ حب الوطنی زیادہ لوگ باہر نہیں گئے اور دوسرے بعض خارجی ممالک نے جاپانیوں کا اپنے ملک میں داخلہ بند کر دیا۔ مثلاً کیلیفورنیا۔ ہوائی اور آسٹریلیا نے جاپانیوں کو ملک کے اندر نہیں آنے دیا برازیل اور پیرو میں زیادہ لوگ نہیں گئے کیونکہ ایک تو یہ ملک جاپان سے بہت دور ہیں اور دوسرے اب نئے قوانین کی رو سے ۱۷۰۰۰ کی بجائے صرف ۲۸۰۰ جاپانی برازیل میں آباد ہوسکیں گے۔ ایشیا میں اُن کو ایسے لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو محنت و مشقت کے لحاظ سے اُن سے کسی طرح کم نہیں اور بوجہ معیارِ زندگی پست ہونے کے وہ معاوضہ کم لینے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہاں ان کی کھپت دشوار ہے۔

معیارِ زندگی کے سوال نے اندرونی ہجرت کو بھی کھٹائی میں ڈال دیا ہے مثلاً فارموسا اور کوریا میں لوگ اسی لئے نہیں جاتے کہ وہاں پست معیار والے لوگ بستے ہیں جن سے تنخواہ اور معاوضہ کے لحاظ سے مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ گورنمنٹ نے چاہا تھا کہ ہوکیڈو میں ایک نوآبادی بسائی جائے لیکن بوجہ سخت سردی کے یہ اسکیم کامیاب نہیں ہوسکی۔

اس لئے بہ حالات موجودہ جب تک وہ مزید علاقے فتح نہ کرے اس دشواری کا دور ہونا مشکل ہے، اسی جذبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مدت سے منچوریا وغیرہ کے علاقہ پر جاپان کی نظر تھی چنانچہ اُس نے وہاں اپنا قبضہ جمالیا اور اب جہول کو ساتھ ملا کر وہاں نوآبادیاں بسائی جارہی ہیں لیکن اس علاقہ کی آب و ہوا بھی جاپانیوں کے موافق نہیں ہے۔ حال ہی میں منگولیا کی سرحد پر جاپان نے فوج کشی کی تھی لیکن روس نے اُن کو پسپا کر دیا اور بہت سے آدمی مارے گئے۔ بہرحال جاپان کی جوع ارضی کی پشت پر اپنی کثیر آبادی کو کھپانے کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور امید ہے کہ وہ جلد یا بدیر ضرور اس میں کامیاب ہوگا۔

صناعت و تجارت اگرچہ آجکل جاپان صنعت و تجارت کے لحاظ سے بہت ترقی کر رہا ہے لیکن ابھی اس شعبہ میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ کئی صنعتیں ایسی ہیں جن کی تنظیم خاطر خواہ

نہیں ہوسکی مثلاً ریشم کی صنعت تاحال اسی قدیم طریق پر چل رہی ہے۔ اگر ریشم کے کیڑوں کی بحفاظت پرورش کی جائے۔ اُن کے خولوں کو اچھی طرح سکھایا جائے۔ اور ریشم کے درجے مقرر کئے جائیں تو بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح تجارت وصنعت کے اور شعبوں میں بھی ترقی کی گنجایش ہے۔

ملک میں اگرچہ کوئلہ اور پٹرول کی کمی ہے لیکن اُس کا بدل برقی رو کی صورت میں موجود ہے۔ جاپان ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ جہاں دریا تیز رو ہیں۔ وہ جہاز رانی کے تو قابل نہیں لیکن اُن سے برقی رو کافی پیدا کی جاسکتی ہے اگر اس کا استعمال کارخانوں میں عام کردیا جائے تو مشینی طاقت کا بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور مصارف پیدایش بھی ہلکے کئے جاسکتے ہیں۔

جاپان کی جغرافیائی حالت ایسی ہے کہ وہ بہ آسانی دیگر ممالک کی منڈیوں تک پہونچ سکتا ہے اور اپنی تجارت کو فروغ دیکر زاید از ضرورت آبادی کو اپنی حدود کے اندر ہی کھپا سکتا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام تدابیر کے پیش نظر ہونے کے جاپان کبھی اس جذبہ کو پس پشت نہیں ڈال سکتا کہ توسیع مملکت ہی سب سے پہلی چیز ہے جو اُسے ایشیا کی سب سے بڑی سلطنت میں تبدیل کرسکتی ہے اور رات دن وہ اسی فکر میں سرگرداں رہتا ہے۔

عبدالرحیم شبلی (بی کام)

مکتوبات نیاز

ادب وانشاء کی دنیا میں وہ چیز جسکی مثال آپ کو اردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات ومحاکات، شوخی ورنگینی سلاست وبےساختہ پن، لطیف وپاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات، کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۲عہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔ ۱۲/ا

منیجر نگار لکھنؤ

ضرورت ہے

رشتہ کی ایک ۱۸ سال کی ناکتخدا لڑکی کے لئے جو معزز خاندان کی نہایت قبول صورت، تعلیم یافتہ، صحیح وتوانا سلیقہ مند، سلیم الطبع سینے پرونے اور کاڑھنے کی ماہر ہے۔ انگریزی نہیں جانتی۔ صرف وہ اصحاب خط وکتابت کریں جو برسر روزگار ہیں یا کوئی ذاتی معقول آمدنی رکھتے ہیں۔ ل۔م۔ ذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

ہندوستان کا ایک مذہبی قاید اور اسکی قوتِ عمل

یعنی

دیال باغ اور بانیِ دیال باغ کی کہانی

مسٹر پٹیس برون نے ہندوستان کے حالات پر ایک سلسلہ مضامین کا شروع کیا ہے جو اسپکٹیٹر میں شائع ہو رہا ہے، اس کا ایک حصہ مستعمرۂ دیال باغ کے متعلق بھی ہے جس کا اقتباس یہاں شایع کیا جاتا ہے۔
اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر کوئی شخص مذہبی قاید کی حیثیت رکھتا ہے تو اس کا اولین فرض اپنی جماعت کی اصلاح کی طرف قدم اُٹھانا ہے اور دوسرے اپنے علماء کرام سے دریافت کرنا ہے کہ کیا اُن کے نامۂ اعمال میں کوئی بڑے سے بڑا عمل ایسا پایا جاتا ہے جو بانی دیال باغ کے ادنیٰ سے ادنیٰ مظاہرۂ قوتِ عمل کے برابر رکھا جا سکے۔

آج دار العلوم ندوہ اور دیوبند کی درسگاہیں اس بات پر یقیناً فخر کر سکتی ہیں کہ انھوں نے سب سے زیادہ چندہ مسلمانوں سے وصول کیا، وہ اس امر پر بھی ناز کر سکتی ہیں کہ انھوں نے بہت سے بے نمازیوں کو نمازی بنا دیا۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ مسلمانوں کو ان سے کیا فایدہ پہونچا، جماعت اسلامی کی اصلاح کیلئے انھوں نے کیا کیا، تو وہ سوائے اس کے کہ آخرت کی توقع دلاکر خاموش ہو رہیں اور کوئی جواب نہیں دے سکتے۔

سو خیر، ان ناعاقبت اندیشیوں کو عاقبت کے بورئے سمیٹنے دیجئے اور آئیے آج کی صحبت میں اُن انسانوں کا ذکر سنئے جنھوں نے مذہب کی صحیح روح کو سمجھا اور اس پر عمل کر کے دکھا بھی دیا۔

انھیں میں سے ایک انسان کا نام انند سروپ ہے (صاحب جی مہاراج سر انند سروپ) اور جو عہدِ حاضر کی تاریخ ولولۂ عمل میں غیر معمولی امتیاز رکھتا ہے۔ مسٹر پٹیس کا بیان ہے کہ "اسوقت فورڈ کے بھی بہت سے متبعین ہیں، اور اسٹالین کے بھی، نازی جماعت کا نظام بھی حد درجہ قابل تعریف ہے اور ڈخوبور کا بھی، میں نے ڈیٹرائٹ، ماسکو، سالٹ لیک سٹی اور برلن جاکر خود ان تمام جماعتوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن جو حقیقت مجھے دیال باغ کی کالونی میں نظر آئی اور مستقبل کے جو امکانات میں نے یہاں محسوس کئے ان کا کہیں اور کوسوں پتہ نہ تھا"

یہ کالونی رادھا سوامیوں کی ہے۔ اس مسلک کے بانی سوامی جی مہاراج ۱۸۱۹ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ یہ ایک دولتمند گھرانے کے آدمی تھے اور فارسی، عربی و سنسکرت کے فاضل تھے۔ ۴۱ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے جدید مسلک کی بنیاد ڈالی اور اس کی علمی تبلیغ شروع کی ۱۸۷۸ء میں انکا انتقال ہوگیا لیکن یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ یکے بعد دیگرے ان کے جانشین ایسے پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اسکو زندہ رکھا اور ان میں سے چوتھے یا سب سے آخری جانشین صاحب جی مہاراج ہیں جو ۱۹۱۳ء میں اس گدی پر بیٹھے اور جن کا ذکر کرنا اسوقت ہمارا مقصود ہے ۔۔۔ رادھا سوامی اس بات کے شایق نہیں ہیں کہ وہ غیر مذہب والوں کے سامنے اپنے عقاید کی تبلیغ کرتے پھریں کیونکہ ان کے مسلک کی بنیاد صرف عمل پر قایم ہے، اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ وہ خدا کو ایک مانتے ہیں اور حیات بعد الموت کے قایل ہیں، ان کے یہاں نہ میلے ہیں نہ تہوار اور نہ کوئی اور نمود و نمایش، سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتے اور نہ کسی مذہبی مناظرہ و مجادلہ میں ان کے یہاں ذات پات کی کوئی تفریق نہیں ہے اور بڑے چھوٹے سب یکساں پاکیزہ و سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

۱۹۱۳ء تک یہ تحریک دوسری جماعت کی ایک معمولی تحریک کی حیثیت رکھتی تھی لیکن جب مہاراج آنند سروپ اس گدی پر بیٹھے تو حالات بالکل بدل گئی اور انھوں نے خیالی دنیا کو چھوڑ کر عمل کی طرف توجہ کی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ خدا نے ہم کو زمین میں اس لئے بھیجا ہے کہ ہم اس دنیا کو جنت بنائیں اور جدید اختراعات سے کام لیں، چنانچہ انھوں نے دیال باغ کو واقعی جنت بنا کر دکھا دیا اور مشینریاں قایم کرکے یہ بھی بتادیا کہ اعلی ایجادات سے کیونکر فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔۔۔ اسوقت دیال باغ کی ترقی کا کیا حال ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس چار مربع میل کی جنت میں ۲۵۰۰ جنتی انسان بستے ہیں، لیکن وہ بیکار وقت نہیں گزارتے بلکہ ان میں سے دو ہزار ۴۱ کارخانوں میں ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کارخانوں میں جو مال طیار ہوتا ہے اس کی برآمد گزشتہ سات سال کے اندر دو چند ہوگئی ہے یعنی اس وقت تقریباً ۱۰ لاکھ کی قیمت کا مال وہاں سے ہر سال باہر جاتا ہے۔ اسوقت ہندوستان کا کوئی قابل ذکر شہر ایسا نہیں ہے جو دیال باغ کی پیداوار سے ناواقف ہو اور جہاں اس کے ممبر موجود نہ ہوں۔ اس وقت رادھا سوامیوں کی تعداد ایک لاکھ ۵۰ ہزار ہے جو ۵۰۳ شاخوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

دیال باغ کی سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز وہاں دودھ مکھن کا کارخانہ ہے جو ۲۰۰ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے اور جس کی عمارتوں وغیرہ کی قیمت کا تخمینہ ۴ لاکھ کیا جاتا ہے۔ یہاں نہ صرف دودھ اور مکھن کی پیداوار کے لئے جدید ترین طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، بلکہ نسل کشی کے بھی تازہ ترین تجربات پر عمل کرکے ان کے نتایج پر غور کیا جاتا ہے۔

بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی یہاں خاص توجہ کی جاتی ہے۔ یہاں کے مدرسہ میں جسکی

عمارت ۴ لاکھ سے زیادہ لاگت کی ہے اس وقت تقریباً ۸۰ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں، جہاں زیادہ تر صحت جسمانی و تعمیر سیرت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایک صناعتی کالج بھی ہے تعمیر میں ایک لاکھ سے زیادہ صرف ہوا ہے۔ یہاں بجلی، موٹر، اور چمڑے کا کام سکھایا جاتا ہے، یہاں ایک کالج لڑکیوں کا بھی ہے جس میں اس وقت سترہ اُستانیاں کام کر رہی ہیں۔

مختلف کارخانوں پر اس وقت تک ۸ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے اور سالانہ تقریباً ۵ لاکھ کا مال طیار ہوتا ہے جس میں موٹر، ڈائنمو، برقی پنکھے، گیس کے چولھے، گھڑیاں، گراموفون، فونٹن پن، چاقو، نب، روشنائی، بٹن، کھلونے، جوتے، اونی موزے، بنیان، آلات جراحی وغیرہ شامل ہیں۔

سرانند سروپ نے مسٹر پٹیس سے کہا کہ ارزاں ریڈیو سٹ بھی وہ بہت جلد بنا کر پیش کرنے والے ہیں۔ ان تمام کارخانوں میں کام کرنے والے سب ہندوستانی ہیں اور سوائے ایک مس کلاپو کے جو زنانہ کالج کی پرنسپل ہیں کوئی ایک انگریز بھی یہاں نہیں پایا جاتا۔

مسٹر پٹیس اور سرانند سروپ میں جو باہم گفتگو ہوئی اس کے بعض حصے سننے کے قابل ہیں۔ سرانند سروپ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ "سرچند میں نے ٹیلیگراف کلرک کی حیثیت سے زندگی شروع کی لیکن دیال باغ کے وجود سے قبل ہی میں دیال باغ کے خواب دیکھا کرتا تھا، چنانچہ جس وقت مجھے اس خاص خدمت کے لئے پکارا گیا تو میں دوڑ پڑا۔"

مسٹر پٹیس نے سوال کیا کہ "آپ کی رائے میں بیس سال بعد ہندوستان کی کیا حالت ہوگی"۔ انھوں نے جواب دیا کہ "فی الحال ہم لوگ ابتدائی منزل میں ہیں لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ دیہات کی اصلاح بہت ضروری ہے اور ہو کر رہے گی۔ میں نے خود قرب وجوار کے گاؤں میں "دیہات سدھار" کا کام شروع کر دیا ہے۔ سخت ضرورت ہے کہ کاشتکاروں کے پاس بہتر مویشی موجود ہوں اور میں سب سے پہلے اسکی کوشش کروں گا۔

مہاتما گاندھی کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب دیا کہ "میں ان کی زاہدانہ زندگی کی تعریف کرتا ہوں لیکن میں ان کی چرخا تحریک کا قایل نہیں، میرے نزدیک یہ تحریک بجائے مفید ہونے کے سخت مضر اور یہاں کے لوگوں کو دائمی غلامی میں رکھنے والی ہے۔ جب تک ہم معمولی معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑا ترک کر کے ترقی یافتہ ممالک کی راہ نہ اختیار کریں کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ میں ہر بات میں مغرب کی تقلید پسند کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مشینری کی سب سے بڑی لعنت ضرورت سے زیادہ صنعتی پیداوار ہے، اسی لئے میں دیال باغ کو دس ہزار آدمیوں سے زیادہ وسیع نہ ہونے دوں گا، البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ہر جگہ اس نوع کی تنظیم کیجائے۔"

بانو

لوگ کہتے ہیں "اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے تھے، اس لئے وہ مرگئی۔ وہ خدا کے ہاں سے اتنی ہی عمر لیکر آئی تھی"۔ مگر میرے دل کو ان باتوں سے تسکین نہیں ہوتی۔ میں تقدیر پرست نہیں ہوں۔ میں ظاہری اسباب پر نظر رکھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر میں ـــ لیکن مجھے سب واقعات شروع سے بیان کرنے چاہئیں۔

آج سے آٹھ برس پہلے کا زمانہ ـــ افسوس کہ اب وہ پلٹ کر نہ آئے گا ـــ میرے لئے بے اندازہ عیش و مسرت کا زمانہ تھا۔ میں اُن تمام ذہنی افکار اور مادی آلام سے آزاد تھا جنھوں نے بعد میں مجھے گھیر لیا اور جو آج بھی میری زندگی کو تلخ بنائے ہوئے ہیں۔ سردی کے موسم میں آغاز بہار کی معتدل فضا اور خوشگوار ہوائیں یاد آجاتی ہیں تو دل کیسا پھڑکنے لگتا ہے، طبیعت کیسی لہرانے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے حواس پر ایک بے خودی سی طاری ہوجاتی ہے، اور دماغ ایک ہلکے سے نشے میں چور ہوجاتا ہے۔ بس بالکل اسی طرح میں اس گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرتا ہوں۔ بالکل انہی جذبات کے ساتھ اُن بیتے ہوئے دنوں کا تصور کرتا ہوں۔ آہ! یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خواب تھا جو بکھر گیا، ایک طلسم تھا جو ٹوٹ گیا، ایک دنیا تھی جو اُجڑ گئی اور اب کبھی آباد نہ ہوگی۔ اللہ! وہ کونسا عیش تھا جو مجھے نصیب نہ تھا، وہ کونسی راحت تھی جو مجھے میسر نہ تھی۔ میں فارغ البال تھا۔ معقول اُجرت پر کارخانے میں کام کرتا تھا۔ میرے شباب کی ابتدا تھی، اور میری ازدواجی زندگی کی بھی ابتدا تھی۔ ہم دونوں، میں اور میری بیوی، بانو جیسی اولاد حاصل کرکے گویا دونوں جہان کی دولت حاصل کر بیٹھے تھے۔ وہ ہمارے دلوں کی ٹھنڈک تھی اور ہماری گودیوں کی راحت۔ ذہین اور سمجھدار اتنی کہ لوگ اُس کی باتوں سے حیران ہوجاتے۔ خوبصورت ایسی کہ جو دیکھ لیتا وہ پیار کئے بغیر نہ رہتا۔ بانو، نہیں تھی، ایک چھوٹی سی حور تھی یا ایک ننھا سا فرشتہ۔ وہ بڑھتی رہی، پروان چڑھتی رہی، اور اُس کے ساتھ ساتھ ہماری امیدوں کا باغ سرسبز ہوتا رہا، ہمارے ارمانوں کی دنیا وسیع ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی زندگی کے پانچ سال ختم کرلئے۔

اور پھر ہماری مصیبتوں کا آغاز ہوا، ایک معمولی سی لغزش کی سزا میں مجھے ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ یہ وہ واقعہ تھا جس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی، جس نے مجھے جنت سے اُٹھا کر دوزخ میں پھینک دیا۔ میں مالی پریشانیوں اور معاشی مشکلوں کے بھنور میں پھنس گیا۔ ساری فراغتیں اور تمام آسودگیاں ختم ہوگئیں۔ وہ صبحیں جب میں دنیا کے سب اہم کاموں سے بے نیاز ہوکر، بانو کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ کراتا تھا، اور وہ شامیں جب میں

اُنگلی پکڑ کر اُس کو باغ میں ٹہلاتا اور اُس کے ہر بے معنی سوال کا جواب تفصیل کے ساتھ دیتا تھا، قصۂ پارینہ بن گئیں، پھر کبھی نہ آنے کے لئے رخصت ہو گئیں۔ ہائے کتنے پُر آشوب دن تھے، اور کیسی محرومیوں کا زمانہ تھا کہ وہ دو محبوب ہستیاں ـــ میری بیوی اور میری بانو ـــ جو ہر وقت نظروں کے سامنے رہا کرتی تھیں اب ہفتوں اور مہینوں آنکھوں سے اوجھل رہنے لگیں۔ آج یہاں ہوں تو کل وہاں۔ دو دن وطن میں ہوں تو دو مہینے پردیس میں۔ گھر سے گویا کوئی تعلق ہی نہ رہا۔ باہر کی دنیا میں، پریشانیوں، مصیبتوں اور مایوسیوں کی دنیا میں، اس طرح گم تھا ـــ گم ہو جانے پر مجبور تھا ـــ جیسے میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے، جیسے میری کوئی بیوی اور بچی ہے ہی نہیں۔ برباد ہو جائے یہ دنیا اور مٹ جائے یہ نظام زندگی جس کے باعث میں بانو کی طرف سے بے پروا رہا۔ اُس بیماری کی طرف سے بے پروا رہا جو آخر کار اُس کی موت بن گئی۔ پہلے پہل اُس کو معدہ کی شکایت پیدا ہوئی۔ اس کا کچھ علاج ہوا، کچھ نہیں ہوا۔ تکلیف بڑھ گئی۔ بخار آنے لگا۔ رات رات بھر بخار میں جلتی اور صبح اس طرح ہنستی کھیلتی اُٹھتی جیسے یہ بیمار ہی نہیں ہے۔ دن بھر کتاب پڑھتی، املا لکھتی، اور کھیل کود میں مشغول رہتی، گویا اس سے زیادہ تندرست کوئی بچہ ہے ہی نہیں۔ آہ بانو بیگم نے ہمیں دھوکا دیا۔ ہم اندھے تھے، نادان تھے، زمانے کے ستائے ہوئے تھے۔ بانو بیگم کے فریب میں آ گئے، اُس کی بیماری کی اہمیت کا احساس نہ کر سکے۔

میں دوسرے تیسرے مہینے پردیس کی خاک چھان کر واپس آتا اور دیکھتا کہ بانو رات بھر بخار میں پھلاتی ہے تو اُس کو کسی حکیم کے پاس لیجاتا۔ حکیم ایک لمحے کے لئے نبض پر اُنگلی رکھتا اور دوسرے لمحے میں نسخہ لکھ دیتا اور کہتا "جگر بڑھا ہوا ہے، یہ دوا پلائیے"۔ چار دن، چھ دن، جب تک میں گھر پر رہتا، بانو دوا پیتی۔ لیکن جب میں چلا جاتا تو علاج پھر ختم ہو جاتا اور بخار کو پھر دو ڈھائی مہینے کی چھٹی مل جاتی۔ یہ سلسلہ تقریباً دو برس جاری رہا۔ اس دوران میں مجھ سے کبھی اتنا نہ ہوا کہ بانو کو کسی بڑے شہر میں لیجا کر کسی معقول ڈاکٹر سے اُس کے مرض کی تشخیص کراتا۔ نہ میرے پاس اس کے لئے فرصت تھی اور نہ مجھ میں اتنی استطاعت۔ اس کے علاوہ میں یہ بات نہ جانتا تھا کہ بانو کی عمر کے بچے بھی دق جیسے مرض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اگر مجھے یہ علم ہو جاتا ـــ اگر ان نااہل طبیبوں میں سے ایک نے بھی مجھے یہ بات بتا دی ہوتی ـــ تو میں بانو کو بچانے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بیچ ڈالتا۔

پچھلی گرمیوں میں میں وطن گیا۔ صبح سویرے گھر پہونچا۔ بانو کھل کھلاتی ہوئی میری طرف دوڑی۔ لیکن میں اُس کو دیکھ کر برق زدہ ہو گیا۔ اُس کے چہرے کی شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ رخسار زرد تھے اور آنکھیں مرجھائی ہوئی۔ جسم پر گوشت کا نام نہ تھا۔ ہڈیاں الگ الگ نظر آ رہی تھیں۔ وہ کتاب لا کر اپنا سبق سنانے لگی۔ اُس وقت اُس کی عمر سات سال تھی اور اس کے بخار کی عمر دو سال۔ لیکن وہ اُردو کی مشکل سے مشکل عبارت پڑھ سکتی تھی۔

مجھے اُس کی بے تکان خواندگی پر خوشی ہوئی۔ میں نے کہا "شاباش بیٹی! خوب ترقی کی ہے تم نے"۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

میں اُس کو دہلی لے آیا۔ ڈاکٹر لطیف کے پاس لے گیا۔ انھوں نے اچھی طرح معائنہ کیا۔ اور پھر مجھے مرض کی نوعیت بتائی۔ میرے خوفناک ترین اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ بہرحال علاج شروع ہوا، وہ علاج جو دو سال پہلے شروع ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بخار اپنا کام کر چکا تھا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ بانو سات مہینے اور زندہ رہی اور ——— اور پچھلے مہینے اس جہاں سے اُٹھ گئی، اپنی خوبصورتی اور اپنی ذہانت، اپنے مستقبل اور اپنے تمام امکانات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ "اُس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے تھے، اس لئے وہ مر گئی۔ وہ خدا کے ہاں سے اتنی ہی عمر لیکر آئی تھی"۔ مگر میرے دل کو ان باتوں سے تسکین نہیں ہوتی۔ میں تقدیر پرست نہیں ہوں۔ میں ظاہری اسباب پر نظر رکھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر میں مالی پریشانیوں اور معاشی مشکلوں میں مبتلا نہ ہوتا، اگر میں زمانے کا ستایا ہوا نہ ہوتا، اگر میں وقت پر بانو کا علاج کرتا ——— کر سکتا ——— تو وہ نہ مرتی، وہ ہرگز نہ مرتی۔ میں اُس کی موت کے حقیقی اسباب سے واقف ہوں۔ میں تقدیر پرست نہیں ہوں!!

اختر انصاری۔ بی۔ اے

"نگار" کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو اُنکے آگے درج ہے:۔

(۱۹۲۲ء) ستمبر ۴ر ——— (۱۹۲۳ء) مئی ۴ر ——— (۱۹۲۴ء) جنوری۔ فروری و اگست ۴ر فی پرچہ۔
(۱۹۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ ——— (۱۹۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۴ر فی پرچہ۔
(۱۹۳۰ء) ستمبر و اکتوبر ۴ر فی پرچہ ——— (۱۹۳۱ء) جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر و دسمبر ۴ر فی پرچہ ———
(۱۹۳۲ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر ——— فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ ——— (۱۹۳۳ء) فروری، جولائی، اکتوبر ۴ر
(۱۹۳۴ء) فروری تا جون و اکتوبر ۶ر فی پرچہ ——— (۱۹۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) ۶ار ——— فروری، اپریل، مئی ۸ر فی پرچہ

مینجر نگار لکھنؤ

ایک غلطی کا ازالہ گزشتہ ماہ کے رسالہ میں مضمون "خلافت"، مولوی جلیل الرحمان صاحب کا ہے۔ خلیل الرحمان غلطی سے لکھ دیا گیا ——— مینجر

ترکی جمہوریت کے دس سال

ترکی جمہوریت کے پچھلے دہ سالہ دور کو ترک "انقلاب" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ کسی سے پوچھئے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا تھے تو جواب ملیگا "انقلاب"!

۱۹۱۹ء کے اعلان صلح و اختتام جنگ کے ساتھ ہی شہنشاہیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور ۱۹۲۵ء میں سرکاری طور پر حکومت کی عنان ایک جماعت کے ہاتھوں میں آگئی۔

اس انقلاب کے بعد اصلاحات کا تانتا بندھ گیا۔ مغربی تمدن۔ مغربی لباس۔ لاطینی رسم الخط۔ مذہبی قدامت پرستی سے بیزاری۔ مذہب اور سیاست کی ایک دوسرے سے علٰحدگی الغرض اسی طرح کی متعدد تحریکوں نے رفتہ رفتہ ترکی کی کایا پلٹ دی۔ ۲۵ رجون ۱۹۲۸ء کو ایک کمیٹی اس غرض سے قایم کی گئی کہ وہ سفارش کرے کہ آیا ترکی قومیت کی فلاح و بہبود کے لئے عربی رسم الخط بہتر ہے یا لاطینی۔ ۶ر اگست کو کمیٹی نے مشورہ دیا کہ لاطینی رسم الخط ترکی مفاد کے لئے ضروری ہے۔ اسی لئے ۳ر نومبر کو نیشنل اسمبلی نے کمیٹی کی سفارش کو منظور کر لیا مغربی تمدن اور لباس کا سوال ترکی کے لئے ایک عرصہ سے غور طلب ہو رہا تھا۔ ماحول اس کا مقتضی تھا کہ ترکی اپنے ہمسایوں کی پیروی کرتا۔

پچھلے سال ترکی جمہوریت کی دہ سالہ یادگار منائی گئی تھی اور اس موقع پر جو کتابچہ شایع ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت عوام لیڈر کی شخصیت کو غیر معمولی اہمیت دیتی ہے۔ جماعت عوام چاہتی ہے کہ ہر شخص کا مطمح نظر خواہ وہ کسی زاویہ سے ہو ایک ہی نقطہ پر پہونچے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کتنا دشوار ہے لیکن جماعت عوام نے بہت کارگر تدبیریں اس کے لئے اختیار کیں۔

سلسلۂ خلافت کو منقطع کرنے کے بعد مُلّا اور محتسب معزول کر دئے گئے، اسلامی قوانین بھی منسوخ کر دئے گئے اور ان کی جگہ سوئٹزرلینڈ کے قانون نے لیلی۔ یہ نیا قانون ترکی کے تمام باشندوں کو بلالحاظ مذہب و ملت یکساں طور پر اپنے اقتدار میں لا سکتا ہے۔ اس سے قبل اسلامی قانون دوسرے مذاہب کے افراد پر بھی واجب التعمیل تھا اور یہی وجہ تھی کہ دوسرے فرقے کبیدہ خاطر اور دل گرفتہ رہتے تھے۔

جدید ضابطہ کے نفاذ (یعنی ۱۹۲۶ء) سے پہلے ترکی میں اسلامی قانون کا رواج تھا اور شادی۔ طلاق اور وراثت کے معاملات میں ہر مذہب کے پیروؤں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے مذہب کی مطابقت کریں لیکن جدید ضابطہ

کے نفاذ کے بعد ان معاملات میں بھی حکومت نے دخل دینا شروع کیا۔ اسلام کی رو سے چار شادیاں جائز ہیں لیکن ترکی ضابطہ دیوانی نے اس کو خلاف قانون بقرار کیا اور ۱۹۲۶ء کے بعد کوئی مسلمان چار شادیاں کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اسی طرح وراثت کے مسئلہ کو حل کیا گیا۔ کیا مرد اور کیا عورت ترکہ میں سب برابر کے شریک سمجھے گئے۔ اسلامی قانون یا دوسرے مذہبی قانون جو برابر کی تقسیم کے طرفدار نہ تھے منسوخ کردئے گئے۔ رفتہ رفتہ اپریل ۱۹۲۹ء تک مذہبی چرچے اور مذہبی برتری و فوقیت مسدود کردی گئی۔ شرع شریف ملاؤں اور محتسبوں کے ہاتھوں سے چھین کر سرکاری محکمۂ امور مذہبی کے سپرد کردی گئی۔ جامعۂ استنبول کے شعبۂ دینیات نے حکومت سے سفارش کی کہ قرآن پاک کے قوانین میں حسب ضرورت ترمیم کیجائے اور چونکہ وہ بہت ادق ہیں اس لئے انھیں عام فہم کیا جائے علاوہ اس کے مذہبی رسوم اور تہواروں کے مواقع پر عربی زبان کی بجائے ترکی زبان میں دعائیں اور مناجاتیں پڑھی جائیں۔ مطلب یہ تھا کہ ترکی قومی زبان ہونے کے علاوہ رفتہ رفتہ مذہبی زبان بھی کہلائے۔ چونکہ عوام عربی سے ناواقف ہیں اس لئے خطبے ترکی زبان میں ادا کئے جائیں تاکہ لوگ انھیں سمجھ کر پورا استفادہ کریں۔ مگر چونکہ ہر انقلاب کی تہ میں اتنا جوش و خروش ہوتا ہے کہ اعتدال کا سوال ہی سامنے نہیں آتا اس لئے یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ترک قوم پرستی کے نشہ سے ایسے متوالے ہوگئے کہ غور و فکر تلاش و جستجو اور اطمینان و سکون اُن سے کوسوں دور تھا اور یہی وجہ تھی کہ اعتدال کی حدوں کو مستی کی حالت میں توڑ کر دیوانہ وار آگے بڑھے۔

جامعہ استنبول کی تجاویز جس وقت جماعت عوام کے آگے پیش ہوئیں تو انھیں کامیابی نہیں ہوئی اور صاف طریقہ پر یہ تصفیہ کیا گیا کہ مذہبی معاملات میں ضرورت سے زیادہ دخل نامناسب ہے۔ ہرچند انقلاب کے معنی صرف سیاسی اور اقتصادی تغیر ہی نہیں بلکہ مذہبی دنیا کی کایا پلٹ بھی ہے لیکن اسوقت یہی مناسب خیال کیا گیا کہ محکمۂ امور مذہبی اس کی نگرانی بطور خاص کرے اور جو تجاویز وہ پیش کرے اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے مگر رفتہ رفتہ جماعت عوام کے خیالات بھی زمانہ کے ساتھ ساتھ انقلاب سے متاثر ہوتے رہے اور ۱۹۳۲ء میں اسکا ثبوت اس طرح ملا کہ 'اذان' ترکی زبان میں دینے کا اعلان ہو ہی گیا۔ اس کے ساتھ ہی گو قانوناً نہ سہی لیکن رواج کے طور پر جامعۂ استنبول کے اکثر مشوروں پر عمل ہوتا رہا اور قیاس کہتا ہے کہ آیندہ بہت ہوگا۔ جماعت عوام کی سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ مدرسوں میں یکسانیت پیدا کی جائے اور طلبہ کو قوم اور ملک کی خدمت کے لئے طیار کیا جائے ۱۹۳۱ء میں تحتانوی تعلیم ترکی زبان کی حد تک محدود کردی گئی اور اس کے نصاب سے مذہبیات کا جز بالکل خارج کردیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں جو کتابچہ ضابطۂ نصاب پر شائع ہوا اس کی رو سے نیکی اور صداقت اخلاقیات کے اہم ترین اجزار قرار دئے گئے۔ زمانہ انقلاب میں ترکی آزادی خیال والٹیر کے نظریہ سے لگ بھگ جا پہونچی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں نے "بیوری" کی مقبول عام تصنیف "آزادی خیال کی تاریخ" کی اسپرٹ کو پالیا ہے اور وہ

اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بیقرار ہیں لیکن ایک واقعہ نے ترکوں کی مذہبیت پر گہرا اثر کیا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں ایک نوجوان ترک مسلم لڑکی نے امریکی اسکول میں عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ چونکہ وہ ابھی نابالغ تھی اس لئے ترکی قانون کے لحاظ سے اس کا عیسائی مذہب اختیار کر لینا درست تسلیم نہیں کیا گیا۔ اسی اثناء میں ایک مشہور ترکی ادیب نے مقامی جریدہ میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "میرے خیال میں جو افراد اسلام چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کرتے ہیں وہ در اصل ترکی قومیت سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں" ہو سکتا ہے کہ کہنے والے کا مطلب صرف قوم پرستی کے جذبہ کی فوقیت منوانا ہو لیکن یہ مطلب بھی پیدا کیا گیا کہ مذہبی انقلاب کے باوجود بھی مذہب اسلام کے دائرے میں رہنا ترکی قومیت کی نشانی ہے۔ اور یہی معنی زیادہ موزوں خیال کئے گئے۔ موجودہ حکومت اپنے سیاسی نظریوں کے پھیلاؤ کے لحاظ سے ترکی کے حدود تک محدود ہے اور یورپ یا دوسرے مقامات کے ترکوں کو اپنے سیاسی مرکز پر جمع ہونے کے لئے دعوت نہیں دیتی۔ حکومت یہ چاہتی ہے کہ باشندگان ترکی کی رگوں میں قومیت کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے۔ زبان کی یکسانیت کا مسئلہ جو لاطینی رسم الخط کو قبول کرنے سے شروع ہوا تھا غیر زبانوں مثلاً عربی فارسی وغیرہ کے الفاظ ترکی زبان سے خارج کر دینے کی تحریک پر ختم ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں نہ قواعد کا خیال کیا جا رہا ہے اور نہ صوتیات کا لحاظ۔ وہ عربی یا فارسی الفاظ جو بغیر کسی قسم کی ثقالت پیدا کئے ترکی زبان کا جزو بن چکے تھے انھیں بھی محض تعصباً نکالا جا رہا ہے۔ حکومت کے طرفدار اخبار و رسایل اس تحریک کے زبردست حامی ہیں اور اکثر جوشیلے ادیب اور انشا پرداز حکومت کی ایما سے اس کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ چونکہ اس قطع و برید کے بعد ترکی الفاظ کا ذخیرہ بہت گھٹ جائے گا۔ اسی لئے اس کمی کو پورا کرنے کی جستجو میں ایک نیا رجحان یہ پیدا ہو رہا ہے کہ ترکی کے مختلف مقامات کے الفاظ اکٹھے کئے جائیں اور آس پاس کے ترک جو بولی بولتے ہیں اس کے لسانی اور صوتیاتی پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ اس کے بعد نئے الفاظ اور محاورے (جو کہ خالص ترکی ہوں) وضع کئے جائیں۔

اس سے زیادہ تبدیلی ترکوں نے تعلیمی میدان میں پیدا کی۔ ۱۹۳۱ء میں انقرہ میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جو ترکوں کی تاریخ پر ریسرچ کرے گی۔ اس کمیٹی نے اسی سال چار جلدیں تاریخ عالم پر شائع کیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تمہیدی جلدیں تھیں۔ ان جلدوں کی ترتیب میں تیرہ ادیبوں نے حصہ لیا تھا۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد مصنفوں نے ترکوں کی ابتدا اور ترکی تہذیب کی اساسی بنیادوں کو دنیا کی قدیم ترین معاشرت پر قائم کیا۔ جغرافیائی تبدل و تغیر پر ان محققین نے اپنی منطق قائم کی۔ ان کا اندازہ ہے کہ وسط ایشیا میں تاریخ کے وجود سے پہلے ایک سمندر تھا اور اس کے ارد گرد مہذب اور متمدن باشندے بستے تھے اور یہ ترک تھے۔ موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے یہ سمندر خشک ہو گیا اور ترک مجبور ہوئے کہ زرخیز زمین کی تلاش میں مغرب کی سمت آوارہ گردی اختیار کریں۔

اسی سلسلہ میں انھوں نے مغربی ایشیا، یورپ اور شمالی افریقہ کے میدانوں کو جا بسایا اور اپنے ساتھ اپنی شہرۂ آفاق تہذیب کے جھنڈے بھی گاڑ دئے۔ لہذا یہ خیال کرنا نامناسب نہیں ہے کہ بعد کے بڑے بڑے تمدن سب ترک تمدن سے فیض یاب ہوئے[1]۔

یہ تاریخی نظریہ ترکی نوجوانوں کے دماغوں میں آجکل بسا ہوا ہے۔ ساری تاریخی تحقیق اسی کی پیروی میں ہو رہی ہے۔ دراصل ترکی تہذیب کا پروپیگنڈا۔ اس کی قدامت اور عظمت کی کھوج متذکرۂ بالا کمیٹی کے قیام اور جمہوریت کے دور دورہ سے کچھ پہلے شروع ہوئی تھی۔ ماہر عمرانیات (Genek Alp Zia) نے یہ کام مشرقی اور شمالی ترکی کے چند ذکی اور صاحب دماغ نوجوانوں کی مدد سے شروع کیا تھا۔ یہ نوجوان سنہ ۱۹۱۰ء میں روس سے ترکی آ بسے تھے۔ اسوقت خیال یہ تھا کہ وسط ایشیا کی ترکی تاریخ کو روشنی میں لایا جائے اور اس کا قطعی سان و گمان نہ تھا کہ مستقبل قریب میں اسی بنیاد پر ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کی جانے والی ہے۔

ترکوں کی اس ذہنیت سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں اپنی تہذیب کی قدامت کا بڑا خیال ہے اور اس کی کھوج میں وہ اسقدر سرگرداں ہیں کہ ماضی قریب کو بالکل فراموش کر گئے۔ انھوں نے آل عثمان کے زمانہ کا تمدن تقریباً بھلا دیا۔ وہ اس کوشش میں نہیں ہیں کہ اس عہد کی یاد ترکوں کے دلوں میں تازہ کیجائے یا دوسروں کو اپنی اس گزشتہ عظمت کا سبق یاد دلائیں۔ اس پہلو پر بعض نقادوں نے روشنی ڈالی ہے۔ خصوصاً پروفیسر جین ڈینی نے ترکوں کی نفسیات پر بحث کرتے ہوئے اس رجحان کو خوب نمایاں کیا ہے۔

اس نظریہ کا اثر "ترکی خیال" پر بھی پڑا۔ ایک نوجوان ترک مصنف نے حال ہی میں ایک دلچسپ کتاب "ترکی خیال کی تاریخ" کے عنوان سے لکھی ہے۔ ابتدا میں اس نے دور قدیم کو ازمنۂ وسطے کے عربی فلسفہ سے جا ملایا ہے اور اس عہد کے نقطۂ خیال کو ترکوں کی دماغ سوزی کا نتیجہ بتایا ہے۔ اس زمانہ کے ماہران سائنس اور فلسفہ مثلاً ابن سینا الفارابی۔ البیرونی وغیرہ کو ترکی نژاد لکھا ہے۔ اس طرح ترکوں نے اپنی تاریخ پارینہ کے منتشر اوراق کی شیرازہ بندی از سر نو کی۔ شاید اس سے منشا یہ ہو کہ اسلاف کے کارناموں کو سامنے رکھ کر نوجوان ترک اپنا مستقبل خوش آیند بنائیں۔

نئے دورِ حکومت نے کسانوں سے بھاری لگان کو بڑی حد تک ہلکا کر دیا۔ پہلے زمین کی ہر پیداوار پر محصول لگایا جاتا تھا لیکن اب یکلخت موقوف کر دیا گیا ہے اور اس کی بجائے واجبی اور معقول لگان جو مقابلتاً بہت کم ہے رائج کیا گیا۔ پہلے فوجی خدمات لازمی تھیں لیکن اب اٹھارہ مہینہ تک لازمی ہیں اس کے علاوہ حکومت نے مراعات و عنایات کی تفریق مٹا دی۔ فرقہ وارانہ سلوک۔ جماعت داری اور طرفداری کے امتیازات حرف غلط کی طرح مٹا دئے گئے۔

---

[1] ملاحظہ ہو "تاریخ" جلد اول صفحہ ۲ تا ۳۰۔ استنبول اسٹیٹ پرنٹنگ ورکس۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترکی کی پوری تاریخ میں جمہوریت اور رواداری کے نظریے کار فرما تھے لیکن آل عثمان کے زمانہ میں حکومتی جماعت بہت طاقت ور ہو گئی تھی اور بعد میں علماء نے بھی عیسائی کلیسا کی فوقیت کے تتبع میں اپنی برتری کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا جس کا قلع قمع صحیح معنوں میں موجودہ جمہوریت نے کیا۔

۱۹۱۲ء میں ترکی میں سیاسی بیداری نے ایسا زور پکڑا کہ ہر قریہ اور ہر قصبہ میں ایک کلب کی قسم کا مقام تبادلۂ خیال کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ مقامات بڑھتے بڑھتے کافی تعداد میں پہونچ گئے اور ان کے ذریعہ سے قوم کی سیاسی تنظیم ہونے لگی۔ اسی اثناء میں موجودہ جمہوریت کے نفاذ کے ساتھ ہی ان مقامات پر بھی عوام کی نظریں پڑیں اور یہ تسلیم کر کے کہ یہ مقامات در اصل سیاسی تبادلہ خیال کے لئے بیحد مفید ہیں انھیں برقرار رکھا گیا۔ بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ بھی کیا گیا اور باضابطہ دیکھ بھال کی جانے لگی۔ لیکن اس درمیان میں چونکہ انقلاب کا زمانہ تھا اور تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں پر نظریں پڑ رہی تھیں اس لئے ان کلبوں کی زیادتی اور آزادی خیال کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ سیاسی نظریہ میں اختلاف نہ پیدا کر دیں اور چونکہ موجودہ جمہوریت ایک جماعتی نظام پر قایم ہے اسلئے محض اس اندیشہ نے کہ شاید مختلف جماعتیں وجود میں آجائیں اور ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو جائیں ان کلبوں نے ایک کانفرنس منعقد کی اور تصفیہ کیا کہ آیندہ سے ان کی نگرانی موجودہ جمہوری یک جماعتی نظام کے ماتحت کر دیجائے عوام نے خطرہ کو رفع کرنے کا یہی واحد طریقہ خیال کیا اس لئے اس پر فوراً عمل کیا گیا۔

نئے دور حکومت میں یک جماعتی نظام نے ملک کی معاشی و اقتصادی حالت کو سنوارنے کا بیڑا اٹھایا اس سلسلہ میں اس کی بڑی کوشش یہ ہوئی کہ ساری صنعتی و حرفتی تجاویز کو قومی جامہ پہنایا جائے۔ ابتدا اس طرح ہوئی کہ ریلوے لائنز جو اسوقت مختلف غیر ملکی کمپنیوں کے سرمایہ سے جاری تھیں حکومت کی جانب سے خریدلی گئیں۔ ساری ریلوے کو اسٹیٹ کے ماتحت کر لینے کے بعد اس کی وسعت کا خیال پیدا ہوا اور گزشتہ دس سال کے اندر اندر دو ہزار دو سو کلیو میٹر کی جدید ریلوے لائن تیار ہوئی۔ جہاں اس سے ملک کی معاشی حالت پر اثر پڑا وہاں فوجی طاقت کے نقطۂ نظر سے بھی حمل و نقل کے ذرائع میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

صنعتی و حرفتی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حکومت نے "پنج سالہ" لایحۂ عمل مرتب کیا جس کی رو سے ملک کی آمدنی کا کافی حصہ کارخانہ جات کے قیام کے لئے مختص کر دیا گیا۔ تمباکو۔ نمک۔ مسکرات۔ دیا سلائی وغیرہ کے اجارے سرکاری یا نیم سرکاری کمپنیوں کے لئے مختص کر دئے گئے۔ ترکی معاشی نظام بعض لوگوں کو سوویٹ روس کے "پنج سالہ" لایحۂ عمل کا پہلا زینہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترکی کے اس نظام کو نیشنل سوشلزم کہا جا سکتا ہے اور اس نظریہ کو پیش کرنے والے دماغ اس کو "منظم اقتصادی انقلاب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ترکی کا محکمۂ مالیات پچھلے سال تک یہ نمایاں کام کر رہا تھا کہ آمدنی اور خرچ دونوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

مندرجہ بالا تجاویز کو کامیاب بنانے اور فوجی قوت کو بڑھانے کی کوشش میں خرچ میں اضافہ ہوا اور آمدنی کے ذرائع کو وسیع کرنے کے لئے نئے نئے ٹیکس عاید کئے گئے (اس کا لحاظ رہے کہ یہ ٹیکس وبال جان نہیں ہیں اور نہ عوام نے اس کو بادل ناخواستہ منظور کیا بلکہ جان بوجھ کر کہ خرچ میں زیادتی کے لئے آمدنی میں بھی کسی نہ کسی طرح اضافہ کرنا ضروری ہے یہ تجویز برضا و رغبت منظور کی گئی) مالی مشکلات پر قابو پانے کے لئے زر کاغذی کو محدود کر دیا گیا اور بدیسی مبادلۂ زر پر بیجا قیاس آرائیوں کا سد باب کیا گیا۔ انھیں اسباب اور تجارتی توازن کو برقرار رکھنے کی وجہ سے ترکی کو اس معاشی بحالی کے زمانہ میں پریشانیوں کا شکار ہونا پڑا۔ اور ترکی کرنسی کی وقعت کسی حیثیت سے بین الاقوامی مارکٹ میں گھٹنے نہیں پائی۔

ترکی جمہوریت کا ایک خاص کارنامہ اس کی فوجی تنظیم ہے۔ یوں بھی دنیا آج لفظ ترک کے معنی ہی ایک خونخوار نڈر اور جنگجو سپاہی کے لیتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جہاں سے ترکوں کی تاریخ شروع ہوتی ہے وہیں سے ان کی تلوار کا لوہا مانا گیا ہے اسی وجہ سے ترک اپنے آپ کو فطرتاً سپاہی سمجھتا ہے اور اگر دول یورپ یہ خیال کریں کہ ترکی کی ساری آبادی جو تقریباً ایک کروڑ ستر لاکھ ہے اس کی مسلح فوج ہے، تو بیجا نہیں۔ نئے دور نے ترک سپاہی کو جدید آلات حرب سے بھی آراستہ کر دیا اور اس میں کے بعض آلات حرب تو خود ترکی کارخانوں کی پیداوار ہیں۔ فوجی طاقت کے لئے محض مسلح سپاہیوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے کارخانوں کی بھی شدید ضرورت ہے جو آلات حرب تیار کر سکیں۔ اس لحاظ سے بھی ترکی اگر یورپ کی بڑی بڑی قوتوں کے دوش بدوش کھڑا نہیں ہو سکتا تو اتنا پیچھے بھی نہیں ہے۔ قومی کارخانوں کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اسلحہ کی تیاری کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔ اس سلسلہ میں گزشتہ چند سالوں میں اس نے کافی ترقی کی ہے اور آئندہ کی توقعات پر گرمجوشی سے میدان عمل میں گامزن ہے۔ سالانہ خرچ کا تقریباً ایک تہائی فوج پر صرف ہوتا ہے اور یک جماعتی نظام کے بیان کے مطابق ترکی فوج نہ صرف بیرونی حملوں اور خطروں کی روک تھام کیلئے ہے بلکہ نئے اصلاحات کے نفاذ اور اس کی حفاظت کے لئے بھی۔

دست بدست لڑائی میں تو یورپ کے کسی ملک کا سپاہی ترکی سپاہی سے مقابلہ کی جرأت نہیں کر سکتا۔ فوجی چال بازیاں جنگ عظیم نے ترکوں کو بھی تھوڑی بہت سکھا دی ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جنگ عظیم کے بعد ہی سے دول یورپ دوسری خوں ریز لڑائی کے لئے کمر کسنے لگے خصوصاً شکست خوردہ ممالک نے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ جرمنی بظاہر نہتا اور مفلس ہے لیکن فرانس سے پوچھئے کہ "بغلی دشمن" کے انتقام کی آگ کے شعلے اسے جھلسا رہے ہیں۔ فرانس ساری دنیا سے محض اسی لئے دوستی گانٹھتا پھرتا ہے کہ جرمنی سے مقابلہ کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ عظیم نے ترکی مملکت کے حصے بخرے کر دئے اور ترکی کی آل عثمان کے زمانہ کی مملکت نہ سہی بلکہ جنگ عظیم کے قبل کی بھی مملکت نہ رہی مگر اب بھی کیا ترک اپنی روایتی سپاہیانہ شان رکھتے ہوئے کسی۔ کالی قمیص والے، نیلی قمیص والے، یا سرخ قمیص والے

سے کم ہے ! — ان داخلی امور کی ترقی کے ساتھ ساتھ جدید حکومت نے امور خارجہ میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس پالیسی کے دو حصے ہیں ایک وہ جس میں ترکی نے اپنے ہمسایہ ایشیائی ممالک سے عہد نامہ جات مرتب کئے جو "معاہدات Treaties of Non-aggression and New." کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ عہد نامہ جات روس، ایران، اور افغانستان سے طے پائے۔ روس نے بھی اسی قسم کے عہد نامہ جات ایران اور افغانستان سے طے کئے اور اسی لحاظ سے ایشیا کی ان چار قوتوں میں بھائی چارہ قایم ہو گیا۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں ترکی نے مغربی ہمسایوں سے اسی قسم کے عہد نامہ جات طے کئے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم وہ عہد نامے ہیں جو یونان - بلگیریا - یوگوسلیویا - اٹلی اور فرانس سے ہوئے اسی سال ترکی نے ایران اور جرمنی سے بعض قدیم معاہدوں کی تجدید کی اور بعض نئے معاہدوں کی طرح ڈالی۔ ۱۹۳۲ء میں ترکی نے جمعیت اقوام میں شرکت کی۔ اور اسکے فوراً ہی بعد یونان اور ترکی کے مابین سرحدی نزاع کے متعلق جو قدیم نزاع چلی آرہی تھی، پہلی مرتبہ دوستانہ تعلقات قایم ہوئے۔ ۹ فروری ۱۹۳۴ء میں بمقام ایتھنز - ترکی - یونان - یوگوسلیویا - اور رومینیا کے مابین اپنی اپنی سرحدوں سے متعلق ایک غیر جانبدارانہ معاہدہ طے پایا۔ بہرحال جدید حکومت کی پالیسی امور خارجہ کے بارے میں امن پسندانہ رہی اور ترک مدبروں کا خیال ہے کہ "جب تک ترکوں کی آزادی اور ترکی جمہوریت پر آنچ نہ آئے اسوقت تک ترکی صلح جو اور امن پسند رہیگا"۔ بعض لوگوں کی خواہش ہے کہ ترکی انقلاب کا موازنہ یورپ کے بعض ممالک کے انقلابات سے کیا جائے لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ دونوں میں یکسانیت صرف اتنی ہی ہے کہ انقلاب ہوا اور بس ! ترکی انقلاب کی روح روال طرز حکومت ہے۔ ترکوں کا خیال عوام کی آزادی کے بارے میں یورپی ممالک سے بالکل علحدہ ہے اور در اصل اسی اختلاف کی وجہ سے دونوں میں مماثلت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یورپ میں شخصی آزادی کا بول بالا ہے مگر ترکی شخصی آزادی کو بھی محصور دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شخصی آزادی حکومت کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے اس لئے شخصی آزادی کو قومی آزادی پر قربان کر دینا چاہئے۔ یہ خیال انقلاب کے زمانہ میں شروع ہوا مگر اب یہ خیال تھوڑا سا بدل گیا ہے اور حکومت ایک عرصہ تک شخصی آزادی کو قربان کر کے "منظم آزادی" کی موید ہوئی ہے۔ مطلب اس منظم آزادی کا یہ ہے کہ آزادی میں انقلاب کا عنصر نہ ہو ورنہ جوش و خروش بے راہ روی پر مجبور کر دے گا۔ اور اسی منظم آزادی سے فایدہ اٹھا کر پچھلے سال پریس نے ترکی بلدیہ پر قدرے آزادانہ تبصرہ کیا ہے ورنہ اس سے قبل حکومتی یا قومی اداروں پر یک جماعتی نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تو کجا تنقید و تبصرہ کرنا بھی جایز نہ تھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ترکی حکومت اب اس نقطہ پر پہونچ چلی ہے کہ شخصی آزادی بھی ایک حد تک وقت اور موقع کا لحاظ کر کے دینی چاہئے۔ ترکی آمریت (Dictatorship) کا دوسری آمریت سے مقابلہ کرنا بھی مشکل ہے اسوجہ سے کہ ترکی میں آمریت کے باوجود بھی دستوری حکومت مروج ہے۔ اگر کوئی مماثلت ہے تو صرف یہ کہ دوسرے آمروں کی طرح ترکی آمر بھی یک جماعتی نظام کا لیڈر ہے اور ایسا لیڈر جس کے حرکات افعال کی باز پرس نہیں !

سید بادشاہ حسین (حیدرآباد دکن)

مذاہب اربعہ میں فطرت کا لگاؤ

یہ وہ دعوے ہے جسے وائی ایم، سی، اے کے ایک جلسہ میں بعض محترم اور قابل بزرگوں نے مذاہب عالم کے متعلق دغالباً اپنے رواداراً نقطۂ نظر کا اظہار فرمانے کے لئے) پیش کیا ہے اور اس کی کوشش کی کہ ان مذاہب اربعہ (برہمنزم، بودھ مت، عیسائیت اور اسلام) کے مابین (فاضل مقرر کی رائے میں) جو فطری یگانگت قایم ہے اُس سے ایسے دلوں کو روشناس کرایا جائے جو ادیان وملل کے بنیادی اُصول سے ناواقف ہوں ــــ آپ نے اُن تقریروں کا اقتباس مقامی اخباروں میں پڑھا ہوگا جو اس قدر مختصر ہے کہ کم سے کم مجھ جیسے ناآشنائے مذہب کے ذوقِ جستجو کی تسکین نہیں ہوئی، اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ فاضل مقررین کے بیان پر کوئی تنقید مقصود ہے، ہرگز نہیں بلکہ مجھے تو اپنے شوق وتلاش کی پیاس بجھانا ہے ـــ میں نواب سرامین جنگ بہادر کے ذوقِ مطالعہ اور وسعتِ نظر سے واقف ہوں اور اسی طرح میں نواب مرزا یار جنگ بہادر کی اُصولی زندگی کو بھی جانتا ہوں، جنھوں نے ایک متمدن دماغ کے سایہ میں تربیت پائی ہے اور دیگر علوم وفنون پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مذہب کے بارہ میں ہر انسان کا نقطۂ نظر ہمیشہ سے جداگانہ رہا ہے اور ہر شخص نے اپنی اپنی عقل کی رہبری میں مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، مگر بہرحقیقت اپنی جگہ ایک ہی رہی ہے اور غالباً اسی کو حاصل کرنے کی یہ کوششیں کی جارہی ہیں جو اس لئے اکثر ناکام اور ناتمام ثابت ہوئی ہیں کہ کسی نے بھی اپنے اپنے ایقان وعقاید سے ہٹکر کبھی غور کرنے کی زحمت نہیں کی ہے اسی لئے جو کچھ میں عرض کروں گا وہ میرے ایسے خیالات ہیں جنھیں میں نے مذہب کے ہر زاویہ سے دور رہ کر صرف ایک انسان ہونے کی حیثیت سے سوچا اور سمجھا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ ان چاروں مذہبوں میں فطرت کا لگاؤ ظاہر کرنے کا مقصد کیا تھا اور کس قسم کا مفہوم باطنی اس میں اپنی بلاغت کو لئے ہوئے ہے۔ مذاہب کا مسئلہ نازک بھی ہے اور آسان بھی لیکن جب کبھی فلسفیانہ نکتہ سرائیوں سے کام لیا گیا ہے، مذہب کے عام فہم اُصول بھی ایک چیستان بنکر رہ گئے ہیں، ایسی چیستان جسے "بوجھنے" کے لئے ذہن انسانی کو نہ جانے کن کن بھول بھلیوں سے گزرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے میں نے ان سطروں کو بہت غور سے پڑھا اور مکرر سکرر پڑھا تاکہ فاضل مقرر کا مقصود اصلی سمجھ میں آجائے۔ بہرحال مذہب کے متعلق میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں اُسے یہاں پیش کرتا ہوں ـــ یہ بالکل ممکن ہے کہ محترم بزرگ نواب سرامین جنگ بہادر کو کوئی ایسا صاحب نظر نہ ملا ہو جو مذاہب کی تنقید میں آزادانہ رائے ظاہر کر سکتا، میرے خیال میں ہم لیسے اہلِ دُنیا سے زیادہ اس کے لئے کسی ایسے معلم روحانی کی ضرورت ہے جس نے مذہب کو صحیح معنوں میں مذہب سمجھا ہو، جو حقیقت کو پا گیا ہو اور جس نے خدا کو مظاہر کائنات میں نہیں بلکہ اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہو۔ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ مذاہب عالم کی بنیاد نیکی و نیکوکاری پر رکھی گئی ہے لیکن یہ تعلق فطرتی آویزش کے لئے کیوں کر کافی ہو سکتا ہے جبکہ مذہب کا فرض صرف عمران وتمدن پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ مذہب کائنات یا تخلیق کائنات کے سلسلہ کی وہ کڑی ہے جو بندہ کو خدا سے ملاتی اس پر نیکیوں کے دروازے کھولتی اور اُسکے دل کی گندگیوں کو دور کرتی ہے

اس لئے مذہب کا اُصول اساسی اصل میں معرفتِ یزدانی ہے اور جو صحت اخلاق کی ذمہ دار بھی ہے تاکہ نفس کی پاکیزگی غالب ہو، ارادو دل میں لطافت کا عنصر قوی ہو اور روح میں بلندی کا احساس اور وہ پرواز پیدا ہو جو اس آب و گل کی دُنیا کو معرفتِ ربانی کی تجلی گاہ سے قریب تر کردے — خدا کی رحمت ہو اُن پر جنھوں نے ابن آدم کو جہل و باطل کی تاریکیوں سے نکالا، جنھوں نے روح انسانی کے عروج و ارتقار کا راز سمجھایا، جنھوں نے گم کردہ راہ دنیا کو حق وصداقت کا راستہ دکھایا، مذہب اگر نہ ہوتا تو نیکی و نیکوکاری راستی و راستبازی کی تعلیم کون دیتا، یہ مذہب ہی کا احساس ہے جسنے انسان کی روح میں بے چینی پیدا کردی، جس نے انسان کے دل میں تحقیق و جستجو کی آگ بھڑکادی، یہ حقیقت ہے کہ مذہب ہی نے سب سے پہلے اُس خدا کو پہچنوایا جو مادی آنکھوں سے نظر تو نہیں آتا لیکن روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا جاتا ہے جو رسالت و امامت کے پنہاں خدوخال سے نقاب اُٹھاتا اور جو صداقت کے راستہ میں بڑی سے بڑی قربانی کو بازیچۂ اطفال سمجھتا ہے — خلیل اللہ کا آتش نمرود سے کھیلنا، ذبیح اللہ کا قربانی کے لئے سر جھکا دینا، روح اللہ کا صلیب کی سختیاں اُٹھانا، رسول اللہ کا توحید کے لئے دنیا بھر کے غم سہنا، خلیفۃ اللہ کا ابن مُلجم کی پیاس بُجھانا اور سید الشہدا کا حق کے لئے جان دیدینا، دُنیا کے حافظہ میں اب بھی باقی ہے اور کیوں نہ باقی ہو جبکہ یہ سب کچھ مذہب ہی کے احساس حقانیت کے مظاہر ہیں — جان اس کائنات میں جیسی کچھ قیمتی شے ہے اُسکو جینے والوں سے پوچھئے اس کی قربانی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس کو وہی دے سکتا ہے جس کے قلبی تاثرات کسی ایسی حقیقت پنہاں سے آشنا ہوں جو جان سے زیادہ عزیز و برتر ہو، اسی کو جانتے ہوئے اُنھوں نے دُنیا کی فانی عشرتوں کو ٹھکرا دیا، وہ اگر چاہتے تو آسمانوں کی بلندیاں ان کے قدموں پر جھک جاتیں شجر و حجر انکے اشاروں پر چلتے، دشت و جبل ان کی عظمت سے لرز جاتے لیکن وہ تو زندگی کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے، اُن کی دل کی آنکھیں اُس ہستی واجب الوجود کی تجلیات سے سرشار تھیں جو ایسی بے شمار کائنات کا تنہا خالق و مختار ہے۔ غرض جب مذہب کی بنیاد خدا کی معرفت اور خدا و بندے کے رشتہ کو مضبوط کرنے پر ٹھہری تو پھر تمام مذاہب کو ایک سطح پر رکھنا اور اس طرح اُن پر غور کرنا گویا وہ ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہیں شاید احقاق حق کے مشرب میں جایز نہ ہو جبکہ یہ طے ہو چکا ہے کہ اس کائنات کا حکمراں اور خالق ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ بسیط و لامحدود ہے تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ الوہیت کے اظہار میں کس مذہب نے کن دلایل سے کام لیا ہے اور خدا کی وحدانیت و یکتائی کی توجیہ کس طرح کی ہے اور خداشناسی و خدارسی کے لئے کون سے ایسے ذرائع متعین کئے ہیں جنھیں عقلِ سلیم آسانی کے ساتھ اور کسی حجت کے بغیر اختیار کر سکے، مذاہب کی حقانیت کو سمجھنے کا یہی ایک ذریعہ ہے اور اسی سے ہم مختلف مذاہب کے مابین حق و باطل کا امتیاز کر سکتے ہیں — ہستی باری تعالیٰ کا عقیدہ مذہب کا اولین عقیدہ ہے اس میں دوسرے مذاہب نے کس قدر غلطیاں کی ہیں اور اہل مذاہب کے قدموں کو کیسی کیسی لغزشیں ہوئی ہیں وہ اس سے ظاہر ہیں کہ کسی نے اینٹ و پتھر کو خدا سمجھا، کسی نے بارش اور ہوا، آگ اور سورج کو اپنا معبود بنایا، کسی نے ذات ربانی سے جسمانی اور انسانی خواص منسوب کردئے، کسی نے باپ اور بیٹے کے رشتوں کا جوڑ لگا دیا، غرض یہ کہ معرفت ناقص اور ایمان فاسد رہا — یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار ہو چکی ہے کہ دنیا کا آخری مذہب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے جو اپنی حقانیت اور خداشناسی کے لحاظ سے خدا کا بالکل آخری پیغام ہے اور معرفت الٰہی حاصل کرنے کا سب سے آسان اور قابل عمل

طریقہ ہے اس لئے اسلام کے ان خدائی خصوصیات کی موجودگی میں دوسرے مذاہب کے اصول سے اس کا مقابلہ کچھ دل لگتی بات نہیں معلوم ہوتی اُن میں اور اس میں جو بنیادی فرق ہے اُس کو صرف حقائق آگاہ نظریں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ مذاہب کے درمیان اختلافات کی صحت و عدم صحت کو جانچنے کا اگر کوئی معیار ہے تو وہ صرف مسئلہ توحید ہے، وحدانیت ہی پر ہم اس امر کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس مذہب کا درجہ کتنا بلند ہے، میری نظر میں "فطری لگاؤ" اگر کسی مذہب سے کسی مذہب کو ہو سکتا ہے تو اس کی پہلی شرط وحدانیت ہے اور وحدانیت ہی فطرتِ الٰہی ہے، آیئے ہم ذرا دُنیا کے ان مذاہب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔ مجھے کسی خاص مذہب سے نہ کوئی پرخاش ہے اور نہ میرے یہ خیالات تعصب و تنگ نظری پر مبنی ہیں کیونکہ میری فطرت کی تشنگی تو ایک ایسے عالمگیر اخوت کے سرچشمہ کی متلاشی ہے جو ساری کائنات کو ایک نقطہ پر جمع کرے، جہاں انسانیت کا احترام ساری بندشوں سے بلند اور برتر تسلیم کیا جائے اور میرے نزدیک یہ صلاحیت صرف اسلام میں ہے جہاں نہ رنگ و نسل کا اختلاف ہے اور نہ حالت و حیثیت کا امتیاز، اس کی یہ صلائے عام تیرہ سو سال سے بلا کسی وقفہ کے کائنات میں گونج رہی ہے۔ ویدمت نے اپنی مذہبی تعلیمات کا خاکہ اُسوقت کھینچا ہے جب انسان نے تمدن کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کئے تھے، ظاہر ہے کہ اُس زمانہ کا انسان رموزِ اسرارِ الٰہی کو سمجھنے کی کیونکر اہلیت رکھ سکتا تھا اور نہ اُس کے دماغ میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی تھی کہ وہ عیب و صواب کو پہچان سکتا، بُرے بھلے میں امتیاز کر سکتا، اُس کی معصومانہ عقل نے فطرت کے مظاہر کو خدا سمجھ لیا اور بجائے اس کے کہ رب الارباب کی عبادت کرتا خاکی اور فانی موجودات کو معبود جاننے لگا، وہ تو مقلدانہ دماغ لیکر پیدا ہوا تھا جس نے جو راستہ بتایا اُس پر بلا سوچے سمجھے چل کھڑا ہوا، اُس کی عقل و فہم کے نزدیک کسی اور رب الارباب کا وجود اُسوقت تھا ہی نہیں، اُس کو یقین تھا کہ اُس کی زندگی کا عروج و زوال فتح و شکست سب کچھ انھیں مظاہر کے رحم و کرم اور قہر و غضب پر ہے۔ اس کے بعد جب دُنیا نے ایک اور کروٹ لی اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم کی ادائی میں طوالت اور پیچیدگی ہونے لگی تو ان کو دور کرنے کی ذمہ داری ایک خاص گروہ کے سپرد کی گئی جو برہمن کہلائے، نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تقدس اس گروہ کی ذات میں ہمیشہ کے لئے منتقل ہو گیا اور یہیں سے برہمنزم کی ابتدا ہوئی۔ غرض برہمن مت پر مختلف دور آتے رہے ہیں، ایسے دور جو ایک دوسرے سے کوئی بنیادی تعلق نہ رکھتے تھے، میں اگر غلطی نہیں کرتا تو عہدِ حاضر میں مورتی پوجا کی رسم اب سوائے ہندوستان کے اور کسی ملک میں نہیں پائی جاتی اور یہ بھی اسی مت کی باقیات سے ہے، جہاں تک میں نے غور کیا ہے فلسفہ ویدانت میں وحدانیت بحیثیت ایک مرکزی عقیدہ کے شروع ہی سے موجود نہیں ہے، قدیم ہندو فلسفہ کا ایک شعبہ "سانکھیہ" تھا جس میں تکوینِ عالم کے نظام سے بحث کی گئی ہے جس میں یہ موجود ہے کہ مادہ ہی دنیا کی علت ہے اور پرماتما یا ایشور کا کوئی وجود نہیں اس فرقہ کے لوگ ۲۵ عناصر کے قائل ہیں۔ نویں صدی عیسوی میں شنکراچاریہ کے مت نے قدیم مت کی اصلاح میں ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ انھوں نے برہم کی ہستی واحد کو لائق پرستش قرار دیا لیکن اُس کے ساتھ ہی دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا کو بھی جائز رکھا۔ ہندو مذہب کا اساس اب ان تین کتابوں پر قائم کر لیا گیا ہے:۔ ۱۔ چاروں وید۔ ۲۔ گیتا۔ ۳۔ منوسمرتی۔ یہ تینوں کتابیں تاریخی حیثیت سے تین مختلف دوروں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ سہ کتب قصہ کہانیوں، فلسفۂ زندگی اور قانونِ حیات کو اپنے

اوراق میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ویدوں نے انسانوں کو کوئی ایسا تخیل بھی دیا ہے جو ان ظاہری دیوتاؤں سے بلند کسی واحد خالق کائنات کی ہستی سے متعلق ہے۔ ممکن ہے کہ یہ قول صداقت پر مبنی ہو لیکن یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر عملی دنیا میں نہیں ملتی رہ گئی بدھ مت سو وہ ایک ”اہنسائی“ مذہب ہے جس کے احکام عشرہ میں سب سے پہلا یہ تاکیدی حکم ملتا ہے کہ ”کسی جاندار کو ہلاک کرو“۔ بودھ نے انسان کی زندگی کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کیا ہے وہ دنیا کے دوسرے حکمار اور بانیان مذاہب کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے، انھوں نے یہ سمجھنے کی سرے سے کوئی کوشش ہی نہیں کی کہ انسان دنیا میں کیوں پیدا ہوا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، اُن کے تمام گیان اور دھیان کا یہ نتیجہ نکلا کہ زندگی فی نفسہ ایک مصیبت ہے، اس چکر سے نجات پانے کی کیا شکل ہے اس کو بودھ نے صرف ایک لفظ ”نروان“ سے حل کیا ہے، اس عقیدہ میں کسی خالق اور مالک کائنات کا وجود شامل نہیں ہے صرف اس تخیل میں تناسخ کا چکر ضرور ہے۔ گوتم بدھ کی مت کوئی مذہب نہ تھا بلکہ ایک اخلاقی فلسفہ تھا اُس کے معتقدات کا سلسلہ کسی خالق کائنات سے نہ ملتا تھا درحقیقت بودھ کے فلسفہ میں خدا کوئی چیز ہی نہ تھا، ان کے بعد بودھ کے پیروؤں نے خود بودھ کے وجود کو خدا مان لیا اور عقیدہ یہ قرار پایا کہ بودھ ایک اوتار کی شکل میں بار بار پیدا ہوتا ہے اور اہل دنیا کے لئے ”نروان“ کا راستہ کھولتا ہے۔ انجیل کے متعلق مسلمانوں کا ایمان ہے کہ وہ نزول کے وقت خدائی کتاب تھی، حضرت عیسیٰ کی پیغمبرانہ شخصیت بھی اُن کو تسلیم ہے لیکن یہ کہے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا کہ توحید کے صحیح اُصول کا فقدان یہاں بھی ہے، توحید کسی ”نجات دہندہ“ کسی بیٹے کے وجود اور کسی روح القدس کی شرکت عمل سے بے نیاز ہے، توحید تو وہ رازِ عرفاں ہے جو بجائے خود نجات دہندہ بھی ہے تجلی ربانی بھی ہے اور معرفت الٰہی کا سیدھا راستہ بھی۔ اسی لئے اسلام نام ہے صرف توحید کا، دعوت توحید کا اور دنیا کو معبودان باطل کی پرستش سے چھڑانے اور ایک نقطہ پر جمع کر دینے کا، یہی تو اس کو تمام ادیان سابقہ کا نچوڑ کہا جاتا ہے اور دنیا میں صرف یہی ایک مذہب ہے جس میں حشو و زوائد کا نام نہیں ہے اور اوہام و قیاسات سے اسے کوئی کام نہیں ہے اور جو یہ دعوے کرنے میں اپنے حقایق کے اعتبار سے بالکل حق بجانب ہے کہ وہ ہر زمانے اور ہر تہذیب کی رہنمائی کیلئے خلق ہوا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر شخص اس پر آسانی سے عمل کر سکتا ہے اور اس کی تعلیمات کو اختیار کر کے دنیا کے کاروباری ہجوم میں معرفت الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام کی تعلیم ترک دنیا کو بُرا سمجھتی اور ایسی ریاضتوں کو غیر ضروری ٹھہراتی ہے جس کو ہر انسان برداشت نہ کر سکے، نہ وہ کسی کی قربانی کو ذریعہ نجات تسلیم کرتی ہے نہ وہ بنی نوع انسان میں کسی اختلاف کو ناجائز سمجھتی ہے، وہ تو تمام انسانوں کو خدا کا بندہ سمجھنے کی توفیق دیتی ہے اور تعصب و تنگ نظری کے تمام نظریوں کو انسانیت کی انتہائی توہین جانتی ہے اور یہی اُس کے اصلی جوہر ہیں۔ اسلام نے کہیں بھی تجلیات الٰہی کو خدا کا اوتار یا نجات دہندہ ظاہر نہیں کیا، وہ تو پیغمبر ہوں یا امام، اصفیا ہوں یا اولیا، سب کو خدا کا بندہ قرار دیتا ہے اور حق تو یہ ہے کہ خدا کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہو سکتا ہے تو وہ خدا کے بندے ہی کا ہو سکتا ہے۔

کاش انسان کو بندہ ہونا نصیب ہو جائے!! غرض اسلام میں نہ کوئی خدا کا بیٹا (نجات دہندہ) ہے نہ کوئی اوتار برگزیدہ کائنات ہے۔ نہ کوئی ایسا خدا ہے جو دنیا کی اصلاح کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف چولے بدلتا رہے۔ نہ اسلام کا خدا کسی کا سہارا چاہتا ہے۔ وہ خالق ہے اور مخلوق کی تمام صفات سے بلند اور منزہ۔ وہ واحد ہے اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے، وہ واحد ہے اپنے افعال و اعمال

کے لحاظ سے، وہ واحد ہے اپنے وجود اور مقصود کے لحاظ سے!۔ یہ ہے اسلام اور اُس کی خصوصی تعلیم جس کا نہ دوسرے مذاہب سے کوئی فطری لگاؤ ہو سکتا ہے اور نہ وہ اپنی تعلیمات کی ان بدیہات کے لحاظ سے فطری کہلانے کے مستحق ہیں، اسی پر انسانیت کو صحیح معنوں میں زندہ رہنا چاہئے یہی عقل کا بھی اقتضاء ہے اور یہی فہم کا بھی ارشاد۔ میں نے مختصراً ان مذاہب اربعہ کا دھندلا سا خاکہ اس لئے پیش کیا ہے کہ برادران ملک "فطری لگاؤ" پر خود غور فرمالیں گے اور سمجھ سکیں گے کہ کیا دنیا بغیر فطری مذہب کے صحیح معنوں میں زندہ رہ سکتی ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ مذہب کو کن حقایق و معارف کا سرچشمہ ہونا چاہئے اور عہد جدید میں جس مذہب کی پیروی انسان کے بڑھتے ہوئے ولولوں کا ساتھ دے سکتی ہے وہ میرے نزدیک صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ اب اگر صرف وحدانیت کے معیار پر ان متذکرہ مذاہب کو جانچا جائے جو نواب سر امین جنگ بہادر کی رائے میں اسلام کے ساتھ "فطری لگاؤ" رکھتے ہیں تو ان مذاہب کے محور تاریخی واقعات "لگاؤ" پیدا کرنے سے ساکت پائے جاتے ہیں۔ اصلی بحث تو یہاں ختم ہو جاتی ہے مگر چونکہ عبادت مذہب کا رکن رکین ہے اور نواب مرزا یار جنگ بہادر نے اس پر ایک ایسے انداز میں اظہار خیال فرمایا ہے جسے سمجھنا ضروری ہے اس لئے چلتے چلتے چند سطریں اس پر بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

نواب صاحب کا خیال ہے کہ عبادت کے لئے کسی خاص طریقۂ عبادت کی ضرورت نہیں ہے، مجھے نواب صاحب کی بلند نگاہی میں شک نہیں ہے لیکن اس انکشاف جدید کو سمجھنا میری محدود عقل سے باہر ہے کیونکہ میں تو آج تک یہی سنتا آیا ہوں کہ جس مذہب نے آنکھ کھولی خواہ وہ باطل ہو یا کامل، خدا کی عبادت کا ایک مخصوص طریقہ اپنے ساتھ لایا جسے بانیان مذاہب نے اپنے عمل سے سمجھایا اور بتایا اس لئے ارکان عبادت سے انکار میرے لئے تو یقیناً ایک انکشاف جدید کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہر نوع مجھے اس قدر معلوم ہے کہ اس مادی دنیا میں بھی مختلف قوانین کی پابندی کئے بغیر زندگی کے دشوار گزار منازل کا طے کرنا دشوار ہے، اسی طرح روحانی عالم کے لئے بھی چند پابندیاں ضروری ہیں جن کے بغیر قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ افعال صادر نہیں ہو سکتے، یہ تو علم النفس کا معمولی مسئلہ ہے کہ ہر کام کی تکمیل کے لئے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہے اور جب تک وہ ماحول پیدا نہ کیا جائے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے بھی ارکان عبادت متعین کئے ہیں اور جہاں تک میری نظر پہونچ سکی ہے یہ کوئی فلسفیانہ سخن گافی اور صوفیانہ نکتہ پروری نہیں ہے، عبادت میں قیام و قعود اور رکوع و سجود کی جو قید عاید کی گئی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب معبود حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو تو عرض و التجا اور تذلل و عاجزی کی تصویریں بن جائے، یہ جذبۂ عبودیت کے فطری طریقے ہیں، جنھیں مرتب کرنے کی مصلحت یہ بھی ہے کہ عبادت کے موقع پر یکسانیت کے ساتھ خدا کی تحمید و تسبیح کی جا سکے، پھر یہ اعمال صرف انسانی دماغ کی اختراع نہیں ہیں بلکہ قرآن پاک میں بھی جا بجا رکوع اور سجود کی ہدایت پائی جاتی ہے:۔ "یا ایہا الذین آمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا" جس شخص کا ایمان و ایقان یہ ہو کہ قرآن مجید کلام ربانی ہے وہ کسی طرح عبادت کے ان مقررہ طریقوں سے قطع نظر نہیں کر سکتا، فطرت الٰہی کے جو رموز عبادت کے ان قواعد و ضوابط میں مرکوز ہیں وہ ہم ایسے انسانوں کے فلسفہ کی دسترس سے بالاتر ہیں اگر پوری تقریر ہمارے سامنے ہوتی تو ہم اس سے زیادہ فاضل مقرر کا منشا، اور مفہوم سمجھ سکتے تھے۔ بہر نوع خدا کی موجودگی شرح سے بے نیاز، مذہب کی حقانیت ثبوت سے مبرا لیکن وہ مذہب جو تاریکیوں کو دور کر دے جو اوہام کو مٹا دے اور جو حقیقت و صداقت کو ضمیر انسانی

پر آشکار کردے، ایسا مذہب قدیم روایات کے سایہ میں نہیں ملتا بلکہ آزادانہ غور وفکر سے حاصل ہوسکتا ہے اس لحاظ سے حضرت بندگانعالی کا یہ ارشاد حرزِ جان بنانے کے قابل ہے کہ :- "ایک طرف مسئلہ مذہب کو کماحقہ سمجھنا جیسا کچھ دشوار نظر آتا ہے تو دوسری طرف یقیناً وہ بہت آسان ہوجاتا ہے جبکہ تعصب کی عینک سے اس کے خط وخال نہ دیکھے جائیں بلکہ عقل کی صحیح رہبری کی روشنی میں اس کی تہ کو معلوم کرلیا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کام ہر کس وناکس کا نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔"

(صبح دکن مورخہ ۱۵ جمادی الاول ۱۳۵۵ھ) مذاہب اربعہ کے متعلق وہ سطور اربعہ ہیں جن کو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کی نظر میں اتنی بلندی ہو اور جن کی فطرت ایسی عالی ہو، ایک طرف یہ سطریں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہم اُس مجتہدانہ دماغ کی پیداوار ہیں جسنے صحیح عقل کی رہبری میں مذاہب عالم کو جانچا اور سمجھا ہے اور اس پختہ کارانہ انداز میں سمجھا ہے کہ دنیا کی کم سواد عقلیں اس گہرے نقش کو دھندلا بھی نہیں کرسکتیں اور دوسری طرف یہ راز ہے اس بصیرت کا جسے دنیا مدت ہوئی حافظوں سے محو کرچکی ہے اس میں تعصب سے بچنے اور حقیقت کو مبصرانہ نظر سے دیکھنے کی ایک حکیمانہ ہدایت کی گئی ہے کیونکہ خاص فطرت دماغ سلطانی اس سے واقف ہے کہ زمانہ مذہب سے ناآشنا ہوچکا ہے اُس پر سلامت ذوق اور فطری استعداد کا بھی فقدان ہوچکا ہے اس لئے اس "مشکل" کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ "یہ کام ہر کس وناکس کا نہیں ہے"۔ سمجھنے والے اس "ہر کس وناکس" کی بلاغت کو جب سمجھیں گے تو اپنے لئے "مشعل راہ" بنا کر رہیں گے، ورنہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانا تو مقدر ہوچکا ہے، اس لئے سنبھل جائیے اور "صراط مستقیم" کو سلطان العلوم کی رہبری میں پالیجئے۔

ہوش بلگرامی

(نگار) ہمارے فاضل دوست مولانا ہوش بلگرامی ہرچند ایک زمانہ ہوا کہ دنیائے صحافت سے علٰحدہ ہوکر اُس دنیا میں زندگی بسر کررہے ہیں جہاں "غم روزگار" کے سوا کچھ نہیں، لیکن فطرت کی مجبوری کو دیکھئے کہ جب کبھی انھیں موقع ملجاتا ہے تو پھر وہی ان کی سحر نگاری ہوتی ہے اور وہی "غم عشق"۔ میں صحافت کو "غم عشق" اس لئے کہتا ہوں کہ نتیجہ دونوں کا وہی بے سروسامانی وچاک گریبانی ہے۔ ہمارے عزیز دوست نے اسلام وتعلیمات اسلام پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ لیکن "نزاعِ کفر و اسلام" کی رسمی واصطلاحی الجھنوں سے ہٹ کر حقیقت کے مطالعہ کرنے کی توفیق کسکو ہوتی ہے۔ مذہب سے کھیلنے والے بہت ہیں لیکن اس کو سمجھنے والے معدوم!

وہ تو کہئے مولانا ہوش حیدرآباد میں ہیں اور اپنی زندگی کی اکثر ساعتیں اس فرید العصر ہستی کے حضور میں بسر کررہے ہیں جو نکتہ رسی وحقیقت شناسی میں اسوقت اپنا جواب نہیں رکھتی ورنہ ہوش کو زمانہ کب اتنی فرصت دے سکتا تھا کہ وہ اتنی ہوش کی باتیں کرتے۔ سچ ہے

جز بہ خلوتگاہِ اسرار او نکشاید نقاب

مکتوبات نیاز

ماشاء اللہ، کیا کہنا ہے۔ آپ اور مدارجِ خُلّت و محبت پر وعظ فرمائیں، یعنی وہ "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"۔ ہوش میں آؤ، تم کہ سب سے بلند ساحل پر کھڑے ہو، ان گہرائیوں پر رائے زنی کرنے چلے ہو جن کا علم طوفان کے تھپیڑے کھانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ شاعری کی دنیا میں اگر تم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے تھے۔ تو کیا میں تم کو بتاؤں کہ حقیقت کسے کہتے ہیں۔ مگر نہیں بتاؤں گا، تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔

اے بےخبر، خلیل کے لئے آگ مہیا کی گئی اور وہ نہ جلے، یہاں آگ کا پتہ نہیں اور جل رہے ہیں۔۔

دشتانِ مابین خل و خمر!

ہاں، صبر اچھی چیز ہے اگر کسی سے بن آئے۔ ورنہ لطف، اسی میں ہے کہ اُدھر ایک ہاتھ سے دامانِ یار چھوٹے اور اِدھر دوسرے ہاتھ سے دامنِ ضبط! ۔ کوئی اور لکھے؟

اے حضرت!

یہ قصہ کیا ہے۔ یوں آپ کو یقین نہیں آتا اور کوئی کہے تو سنتے نہیں۔ آخر یہ گتھی سلجھے تو کیونکر؟

یا مجالِ گفتن وہ یا نگفتہ باور کُن

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور اگر میں قسمیں کھانے کا عادی ہوتا تو کائنات کی ہر ہر چیز کو شاہد بنا کر یقین دلاتا کہ جمیل کے مُنھ سے ایک لفظ اس باب میں کسی کے سامنے نہیں نکلا۔ آپ فرمائیں گے "کیا تو ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے جو اس وثوق سے کہتا ہے"۔ میں کہوں گا "ہاں"۔ کیونکہ میں اس شخص کی فطرت سے آگاہ ہوں، اسکی روح کا رازدار ہوں اور اس پر اتنا اعتماد رکھتا ہوں کہ وہ کہیں بھی ہو، گویا میں اس کے ساتھ ساتھ ہوں۔

جو لوگ کانوں کے کچے ہوتے ہیں وہ ضد کے پکے نہیں ہوا کرتے۔ آپ میں یہ عجیب بات ہے کہ وہ بھی ہیں اور یہ بھی ۔۔ اللھم احفظنا من کل بلاء

جمیل بیتاب ہیں کہ ایکبار انھیں رخصت باریابی ملجائے تو وہ خود آکر جو کچھ کہنا ہے آپ سے کہیں۔ معلوم نہیں آپ کی طبع بدگماں اس کو روا رکھے گی یا نہیں۔ بہرحال اگر اس کا امکان ہو تو ان کی یہ تمنا پوری کر دیجئے۔ اس میں

حرج ہی کیا ہے اور اگر آپ نے کسی بیگناہ کے خون سے دامن آلودہ کرنے کا عزم ہی کر لیا ہے تو بسم اللہ، شوق سے خنجر اٹھائیے ـــ لہو پکاریگا آستیں کا!

جانِ عالم،

کیا بتاؤں، کل شام سے کس عالم میں ہوں بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے ہیں، کوندا لپک رہا ہے، بادل گرج رہے ہیں، ہوائیں چل رہی ہیں اور رم جھم رم جھم مینھ برس رہا ہے۔ ویسے یہاں تو دوپہر ہی سے تھا لیکن شام کو یہ شیام رنگ محفل ایسی جمی ایسی رچی کہ اب کیا کہوں۔ معلوم ہوتا ہے کنور کنھیا پاؤں میں گھونگرو باندھے ہوئے بانسری بجا رہے ہیں، بجتیا بانہ رقص کر رہے ہیں اور شاید پاؤں کی آخری ضرب، گھونگھروؤں کی آخری جھنکار اور بانسری کے آخری بول کے ساتھ بساطِ عالم بھی ہمیشہ کے لئے اُلٹ دیجانے والی ہے۔

تم جانتے ہو کہ ایسے موسم میں سوائے بیکار بیٹھے رہنے اور گنگنانے کے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ گنگنانا اس لئے کہتا ہوں کہ اگر اسے میں نے گانا کہدیا تو تم ہنس پڑوگے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں گایا اور تنہائی میں جتنی قوت و آزادی کے ساتھ ایک شخص گا سکتا ہے میں بھی گایا۔ مگر صرف ایک شعر۔ کامل ۴ گھنٹے گزر گئے ہیں مگر وہی ایک شعر زبان پر ہے۔ نہ زبان تھکتی ہے نہ دل آسودہ ہوتا ہے۔ خدا سمجھے غالب سے۔ تم بھی سُن لو:-

دہید بادہ گلفام و چوں سلام کنم

ہماں بہ بادہ سلام مرا دہید جواب

بارگاہِ حسن، کارگاہِ می و مینا، صحبتِ رقص و نغمہ، اہتمامات رندی و سرمستی الغرض دنیائے خرابات کا وہ کونسا "خلد فروش" منظر ہے جو اس میں نہیں، اور عالم ہوا و ہوس کی وہ کونسی انسان۔ کو۔ خدا۔ بنا دینے والی ادا ایسی ہے جو اس شعر سے نمایاں نہیں ـــ میرے سامنے تو رات بھر یہی محفل جمی رہی اور اسی شور و نوشانوش میں ستارۂ سحری طلوع کیا۔ اللہ اللہ جس چیز کے خیال میں اتنا لطف ہے، اس کا حصول کیا قیامت ہوگا۔ یہ تمھارے سوچنے کی چیز ہے اور توفیق ہو تو کر دکھانے کی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان سے اگر آپ موسم کو جدا کر دیں تو پھر سوائے مولویوں کے یہ کسی اور کے رہنے کے قابل ہی نہ رہے۔ غالب کا فیصلہ بھی یہی ہے۔

بہارِ ہند بود برشگال، ہاں غالب! دریں خزانکدہ ہم موسم شرابے ہست

ضرورت ہے

نگار جنوری تا جون و اگست ۲۵ء - اپریل ۳۱ء - جنوری تا اپریل جون و ستمبر ۳۳ء جنوری فروری جلائی و اگست ۳۴ء اور مارچ جولائی اکتوبر ۳۵ء کی جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں اطلاع دیں۔

مینیجر نگار

باب الاستفسار

(کیا ہندوستان میں زکوٰۃ ادا کیا جانا واجب ہی)

(جناب شفیق احمد خانصاحب۔ جاگیر دار سرونج)

زکوٰۃ کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے۔ زمانہ موجودہ میں ہندوستان میں مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں۔ مصالح مذہب پر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ مصلح جنگی وعمومی کی غرض سے یہ ٹیکس قایم کیا گیا تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسلمانوں پر بیت المال کی آمدنی کے لئے یہی ایک ٹیکس تھا اور کوئی ٹیکس نہیں تھا گویا حکومت کو جو ٹیکس ادا کرنا چاہئے تھا وہ بصورت زکوٰۃ ادا کیا جاتا تھا اور عشر یا زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان اور کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے اب ہندوستان میں مسلمان حکومت کو مختلف قسم کے بہت سے ٹیکس ادا کرتے ہیں اس لحاظ سے مسلمان تو اپنے مال سے اُس رقم سے زیادہ دیدیتے ہیں جو اسلام چاہتا ہے اب یہ بات علٰحدہ رہی کہ غیر مسلم حکومت ہونے کی وجہ سے وہ تمام اغراض پوری نہیں ہوتیں جو حکومت اسلامیہ ہونے کی صورت میں ہونا چاہئے تھیں اس لئے زکوٰۃ مسلمانوں پر فرض نہیں رہتی جس طرح کہ غیر مسلم حکومت میں دیگر احکام شرعیہ کا نفاذ نہیں ہوتا اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ بھی فرض نہیں رہتی یہ امر علماء کی نظر سے پوشیدہ تو نہیں ہوگا لیکن ذریعہ آمدنی ہونے کی وجہ سے فرض نہ ہونا ظاہر نہیں کرتے اس لئے آپ سے استدعا ہے کہ غور فرما کر تفصیل سے نگار میں شایع فرمائیے کہ دراصل ہندی مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں۔

(نگار) عبادات ہوں یا معاملات اصل چیز دیکھنے کی صرف یہ ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے وہ کس نیت اور ارادہ سے کرتا ہے، نیز یہ کہ اس کا اصل مقصود کیا ہے۔ پھر جس حد تک معاملات دنیاوی کا تعلق ہے خلوص نیت کی چھان بین کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ایک بد معاملہ انسان خود بہت جلد معلوم کر لیتا ہے کہ مکر و فریب سے سوائے نقصان کے کوئی فایدہ نہیں ہے اور اس لئے اس کو اپنے کئے کی سزا یہیں مل جاتی ہے، لیکن اگر عبادات میں دیانت و امانت کا لحاظ نہ رکھا جائے تو کوئی پوچھنے والا نہیں سوائے اس صورت کے کہ مرنے کے بعد ہی نکیرین بھاری

گرز لیکر آئیں اور مزاج پُرسی کریں لیکن یہ صورت بالکل "مشتِ بعد از جنگ" کی سی صورت ہے۔ جس سے خدا اور بندہ دونوں میں سے کسی کا بھی فایدہ متصور نہیں۔

مثلاً آپ نماز کو لیجئے کہ اس کا اصل مقصود صرف یہ ہے کہ لوگوں میں اجتماعی احساس پیدا ہو، اور ان میں باہمدگر ایک دوسرے کے ساتھ اخوت و ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں، لیکن اگر اس مقصد کو نظرانداز کردیا گیا اور صرف اُٹھنے بیٹھنے ہی کو اصل مدعا سمجھ لیا گیا تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ادائے نماز کا فرض پورا ہوگیا۔ یقیناً نہیں ہوا۔

اب آپ مسئلۂ زکوٰۃ کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ ادائے زکوٰۃ کے لئے مخصوص حالات و شرایط کا پایا جانا ضروری ہے۔ یعنی جب تک مال کی کوئی معین مقدار ایک متعین زمانہ تک کسی کے پاس نہ پائی جائے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ یہ تو ہوئی قانونی صورت، لیکن زکوٰۃ کا اصل مقصود کیا ہے؟ اپنے عزیزوں اور قوم کے اُن افراد کی جو مستحق امداد ہیں، مدد کرنا۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس مقصود کو نظرانداز کرکے صرف قانونی حیلہ جوئیوں سے اپنے آپ کو ناقابل ادائے زکوٰۃ ثابت کرے تو آپ اس کو کیا کہیں گے۔ فقہی کتابوں میں زکوٰۃ سے بچنے کی متعدد صورتیں ظاہر کی ہیں اور ہمارے بہت سے علمار کرام ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اختتام سال کے قریب تمام مال بیوی کے نام منتقل کردیا اور جب دوسرا سال ختم ہونے میں آیا تو بیوی نے پھر میاں کو دیدیا۔ لیکن افسوس ہے کہ فقہ اسلامی نے ان بہانہ سازیوں کا کوئی انسداد نہ کیا۔ ایسے لوگوں کو صرف عذاب خداوندی کے حوالہ کرکے خاموش ہوجانا کبھی ایسی فطرت والوں کے باعث عبرت نہیں ہوسکتا۔ ضرورت تھی کہ ایسی صورتوں میں دوچند زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا جاتا اور محتسب کو اختیار دیا جاتا کہ وہ ایسے بدطینت لوگوں اور شرعی بہانہ ڈھونڈھنے والے مولویوں کی دِرّوں سے خبر لے۔

الغرض ایک چیز قانون پر عمل کرنا ہے اور دوسری چیز اس کی روح کو سمجھنا ہے۔ آجکل مسلمان نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں لیکن صرف قانونی حیثیت سے، رسمی صورت سے۔ اصل مقصود و مدعا کسی کے سامنے نہیں ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ہمارے مذہب کو بے روح اور ہمارے اجتماع کو درہم و برہم کردیا ہے۔

یہ میں نے اس لئے ظاہر کیا کہ آپ کے استفسار سے بھی اسی قسم کی شرعی بہانہ جوئی کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ حکومت کی طرف سے جو ٹیکس آپ پر عاید ہوتے ہیں وہ زکوٰۃ کی اس رقم سے زیادہ ہوتے ہیں جو شرعاً آپ کو ادا کرنا چاہئے لیکن چونکہ زکوٰۃ کا اصل مقصود اس سے پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے آپ اُسے زکوٰۃ میں محسوب نہیں کرسکتے اور نہ اُسوا کرنا چاہئے۔

حکومت جو ٹیکس آپ سے وصول کرتی ہے وہ معاوضہ ہے اس بات کا کہ آپ کے موٹروں کے لئے

وہ صاف ستھری سڑکیں طیار کرتی ہے، آپ کے بقاء صحت کے لئے شہر کی صفائی کا اہتمام کرتی ہے اور آپ کی سیر و تفریح کے لئے نزہت گاہیں قائم کرتی ہے۔ اور اگر آج بجائے برطانیہ کے آپ ہی کی حکومت یہاں ہوتی تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ کے وہ احکام جو ساڑھے تیرہ سو سال قبل نافذ کئے گئے تھے اسوقت بھی مناسب سمجھے جاتے۔ اور اگر زکوٰۃ کے متعلق وہی احکام قایم رہتے تو کیا ان تمام عمرانی ضروریات کے لئے جو ترقی زمانہ کے ساتھ ساتھ سامنے آتی ہیں کوئی اور ٹیکس آپ پر عاید نہ کیا جاتا۔

پھر اس کو بھی جانے دیجئے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ لوگ جو حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں، کیا اتنے غریب ہو جاتے ہیں کہ سوائے اسباب سدِ رمق کے ان کے پاس اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ پھر اگر صورتِ حال یہ نہیں ہے تو ادائے زکوٰۃ کے باب میں ٹیکس کی ادائی کا بہانہ کیوں ڈھونڈھا جائے۔

میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص ٹیکس ادا کرتا ہے، لیکن اس کے موٹر کے پٹرول کا خرچ بھی وہی ہے اور سینما جانے کے مصارف بھی اتنے ہی۔ وہ بدستور نفیس کپڑے پہنتا ہے اور لذیذ غذائیں کھاتا ہے۔ پھر کسقدر افسوسناک ذہنیت ہے کہ ٹیکس کا بار ہمارے تعیشاتِ زندگی میں کسی کمی کا باعث نہ ہو نہیں، اور ادائے زکوٰۃ کے باب میں ہم اس کا حیلہ ڈھونڈھیں۔

آج یہاں مسلمانوں کی حکومت ہو یا نہ ہو، شرع اسلام کا نفاذ ہو یا نہ ہو، ٹیکس کا بار آپ کے لئے قابل برداشت ہو یا نہ ہو۔ لیکن یاد رکھئے کہ زکوٰۃ کا بار آپ کے سر سے اسوقت تک ہلکا نہیں ہو سکتا جب تک قوم کا ایک فرد بھی محتاج و مفلس باقی ہے۔

آپ ٹیکس سے بچنے کے لئے جھوٹے رجسٹر بنا سکتے ہیں، غلط اندراجات سے اپنی آمدنی کم دکھا سکتے ہیں، رشوتیں دے دیکر یا سفارشیں پہونچا پہونچا کر اس بار کو ہلکا کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ اس حقیقت کو کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں کہ ٹھیک اسوقت جب آپ موٹر پر سوار ہو کر نکلتے ہیں آپ کا ایک بیمار و پاشکستہ عزیز مجبوراً گھر کے اندر پڑا کراہ رہا ہے اور عین اسی لمحہ میں جب آپ کی میز پر لذیذ کھانوں کی وزنی قابوں سے چرچرا رہی ہیں، آپ کے محلہ کے خدا جانے کتنے یتیم بچے اور کتنی ضعیف بیوائیں فاقہ کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ پھر اگر آپ اس حقیقت کو محو کر سکتے ہیں تو بیشک ادائے زکوٰۃ کے لئے ٹیکس کا بہانہ پیش کر کے آپ اس سے نجات حاصل کر لیں، لیکن اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو پھر ایسے شرعی حیلے ڈھونڈھنا صرف اسی مولویانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جو شعایرِ مذہب کو رسم و رواج کی صورت تو دے سکتی ہے لیکن مذہب کی روح سے باخبر رکھ کر اپنے آپ کو ایثار و قربانی کے عذاب میں کبھی مبتلا نہیں کر سکتی

خویش را صورت پرستاں ہرزہ رسوا کردہ اند
جلوہ معنی نماند در معنی نقابے بیش نیست

ایک عجیب استفتاء

(جناب محمد حسین صاحب ۔ بسی پٹیالہ)

اسلام علیکم ۔ استفتا کی نقل جناب کی خدمت میں روانہ کی جاتی ہے کہ جناب بھی اس پر کچھ روشنی ڈالیں دیگر علماء کرام کو بھی بھیجا گیا ہے ۔ جواب کی اطلاع جناب کو کی جاوے گی ۔

نقل استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ : دہلی میں ایک مولوی کفایت اللہ ہے ، جو اپنے آپ کو مفتی کہلاتا ہے ۔

(۱) گاندھی (جو صریحا کافر ہے) کو اپنا رہبر تسلیم کرتا ہے ۔ اور اُس کے ہر حکم کو واجب التعمیل سمجھکر اُس پر خود بھی عمل کرتا ہے اور مسلمانوں کو بھی اُس پر عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے ۔ مثلاً جب گاندھی حکومت سے عدم تعاون کرتا ہے اور اسمبلی کا بائیکاٹ کرتا ہے تو گاندھی کے حکم کے بموجب حکم ہوتا ہے کہ اسمبلی اور کونسل کا ممبر بننا حرام ہے ۔ اور جب گاندھی اسمبلی میں اپنے آدمیوں کو بھیجتا ہے تو خود بھی اُس کے پٹھوں کے حق میں وعظ کہتا پھرتا ہے جب گاندھی نمک کا قانون توڑتا ہے تو اُس کے اس فعل کو شرع شریف کے مطابق ثابت کرتا ہے ۔ جب گاندھی وایسرائے سے صُلح کرتا ہے تو خود بھی الخاموشی نیم رضاء کا مصداق بن جاتا ہے ۔

(۲) فوج پولیس کی ملازمت اور وکالت کو حرام پیشہ کہتا ہے اور خود اُن سے نذرانہ قبول کر کے ہضم کر جاتا ہے ۔

(۳) اُن مسلمانوں کو کافر بتاتا ہے جن کے عقاید اور عمل یہ ہیں کہ وہ خدا کو وحدہ لاشریک جانتے ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو آخری نبی مانتے ہیں ۔ روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں خدا اور رسول صلعم کے تمام حکموں کو واجب التعمیل سمجھتے ہوئے اُن پر عمل پیرا ہوتے ہیں ۔۔ اگر مندرجۂ بالا سطور صحیح ہوں تو کیا :۔

(۱) مولوی کفایت اللہ دائرۂ اسلام کے اندر رہے ؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو کیا

(۲) اُس کو فتویٰ دینے کا حق ہے ؟

(۳) کیا عامۃ المسلمین پر اُس کے فتوؤں کی پابندی لازمی ہے ۔

(نگار) آپ کی تحریر سے مترشح ہے کہ آپ مولانا کفایت اللہ صاحب کو کافر ۔ نہایت ہی مکروہ قسم کا کافر سمجھتے ہیں اور دوسروں سے بھی یہی سننا پسند کرتے ہیں ۔۔ آپ نے اچھا کیا کہ یہ استفسار مولویوں کے پاس بھی بھیجدیا کیونکہ ان میں سے اکثر کا

پیشہ ہی "کافرسازی" ہے اور وہ ایسے ہی بہانوں کی تلاش میں ہر وقت رہتے ہیں۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ آپ نے یہ استفسار میرے پاس کیوں بھیجا۔ اس شخص کے پاس جو کافروں کو بھی مسلمان ہی سمجھتا ہے اگر وہ اچھے اخلاق کے ہوں۔

ایک الزام مولانا کفایت اللہ صاحب پر آپ نے یہ قایم کیا ہے کہ وہ گاندھی جی کا تتبع کرتے ہیں یعنی جو بات گاندھی جی کہتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں۔ اگر کوئی اچھی بات صرف اس لئے بُری ہو سکتی ہے کہ وہ ایک غیر مُسلم کا بھی شعار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام مسلمانوں کو سچ بولنا چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ گاندھی جی اور بہت سے ہندو سچ بولتے ہیں اور سچ بولنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ فوج و پولیس کی ملازمت اور وکالت کو ناجایز بتاتے ہیں اور خود ان سے نذرانے لیا کرتے ہیں۔ اول تو مجھے اس کا مطلق علم نہیں کہ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں یا نہیں لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم درست باور کرلیں تو بھی میری رائے میں وہ ان پیشوں یا ملازمتوں سے اظہار نفرت کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں، رہ گیا نذرانہ کا سوال سو اگر یہ صحیح ہے تو زیادہ سے زیادہ اسے خلاف تقویٰ کہہ سکتے ہیں۔

تیسرا الزام یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو کافر بتاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ میرے سامنے اس کی کوئی مثال موجود نہیں اور نہ آپ ہی نے کسی ایسے واقعہ کی تفصیل بیان کی لیکن اگر یہ واقعہ ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ مولویوں کی یہ ذہنیت عام ہے اور جب تک حدیثوں کا دفتر بے پایاں موجود ہے، کسی کو کافر کہدینے کے لئے دلیل و سند کی کمی نہیں۔ جب انھیں حدیثوں کی مدد سے ایک فریق حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق ایسی ہستیوں کو بھی منافق ثابت کر سکتا ہے تو ہمارا آپ کا کیا ذکر ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے آپ بہت عرصہ سے نگار کا مطالعہ کر رہے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ کفر و اسلام کے باب میں آپ کی پستیِ خیال کا عالم ابتک وہی ہے۔۔ یاد رکھئے کہ پتھروں کی پوجا کرنے والا انسان حقیقتاً کافر نہیں ہے بلکہ صحیح معنے میں کافر وہ ہے جو اپنے نفس کا پرستار ہے، اپنے اغراض کا بندہ ہے اور اپنی تنگ و تاریک ذہنیت کا غلام۔ کیونکہ پتھر کے بتوں کو تو ہم آسانی سے توڑ سکتے ہیں، لیکن اس "شیطان" کا علاج آسان نہیں، جو پہلے انسان کی عقل و فراست چھین لیتا ہے اور پھر اس کو اپنا مرکب بنا کر جدھر چاہتا ہے لئے پھرتا ہے۔۔ آپ مولانا کفایت اللہ کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھنے سے قبل پہلے اس کا فیصلہ کیجئے کہ آپ خود بھی واقعی مسلمان ہیں یا نہیں، نیز یہ کہ آپ جو ان کی "کافرسازی" کو مورد الزام قرار دیتے ہیں، خود ان کو "کافر بنانے" میں کس حد تک اسلام کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ خدا نہ کرے آپ مولوی تو ہیں نہیں، پھر اس "تسبیح و زنار" کے جھگڑوں میں آپ کیوں پڑتے ہیں۔ درندوں کا کام درندوں ہی سے خوب بن آتا ہے۔ کیا آپ کے لئے اس تعلیم میں کوئی کشش نہیں ہے کہ

کافر و کفر و مسلمان و نماز و من و عشق،
ہر کسے را کہ تو بینی بسر خود دین است ۔۔۔۔ لکم دینکم ولی دین

مطبوعات موصولہ

محاربۂ کربلا امامیہ مشن لکھنؤ کا ۲۷واں رسالہ ہے جس میں واقعات کربلا کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مولف ادیب شہیر مولانا سید علی نقی صاحب ہیں جو تصنیف و تالیف کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور متعدد رسایل امامیہ مشن کے شعبۂ تبلیغ کے لئے اس سے قبل لکھ چکے ہیں۔ سلسلۂ تبلیغ حسینی کا یہ تیسرا رسالہ ہے۔ اس سے قبل محاربۂ کربلا اور معرکۂ کربلا کے نام سے دو رسالے اور شائع ہو چکے ہیں جن میں واقعات آغاز جنگ تک کا استقصاء کیا گیا تھا۔ رسالۂ زیر نظر میں واقعات جنگ بیان کئے گئے ہیں۔

تاریخ اسلام میں واقعۂ کربلا اتنا زبردست حادثہ ہوا ہے کہ اس کی نظیر کوئی دوسری نہیں ملتی، نہ صرف اس لحاظ سے کہ امام شہید نے جو اسوہ اس جنگ میں پیش کیا وہ صداقت پرستی کی عدیم النظیر مثال تھی، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ اس نے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو دو علیحدہ جماعتوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اس لئے اگر اس حادثہ کی تفصیل بیان کرنے میں غلو سے کام لیا گیا ہو تو حیرت نہ کرنا چاہئے۔

ذکر شہادت پر موجودہ زمانہ میں بھی بہ کثرت کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے اُن میں سے اکثر پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور ان کا مرتبہ بھی وہی ہے جو ذکر میلاد کی کتابوں کا کہ سوائے لغو و مہمل باتوں کے ان میں کوئی ایک بات بھی کام کی نہیں پائی جاتی۔

یہ رسالہ چونکہ کسی عامی کا لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ ایک ایسی ہستی کی کاوش کا نتیجہ ہے جو فضل اجتہاد کی حامل ہے اس لئے اس کی سطح یقیناً بلند ہونی چاہئے اور ہے، لیکن یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ محاربۂ کربلا کی اتنی تفصیل معلوم کرنیکے ذرائع مورخین کے پاس کیا تھے۔

جنگ سے پہلے اور عسکر حسینی کے میدان کربلا میں آنے سے پہلے جو واقعات پیش آئے اُن کے روایت کرنے والے تو خیر مل سکتے تھے اور ایک حد تک ان کی تفصیل بھی معلوم ہو سکتی تھی، لیکن واقعات کربلا کے متعلق جزئیات کا علم اور وہ بھی اس حد تک کہ فلاں نے میدان جنگ میں جانے سے قبل یہ یہ کہا، اس اس طرح طیاریاں کیں، اور فلاں فلاں داؤں پیچ استعمال کئے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔

واقعۂ کربلا کے سلسلے میں جناب حسین اور اُن کے اعزہ و رفقا وغیرہ کے باہم گراں قدر مکالمے تاریخوں میں دیکھے جاتے ہیں کہ اگر اُن کو یکجا کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب طیار ہو سکتی ہے، لیکن سوال یہی ہے کہ اس حادثہ کے بعد

کتنے ایسے قوی الحافظہ لوگ جناب حسین کے لشکر کے باقی رہ گئے تھے جنھوں نے ان سب کو لفظ بہ لفظ روایت کیا اور اس عالم اضطراب و پریشانی میں کب کسی کے اتنے حواس باقی رہ سکتے تھے کہ وہ ان تمام جزئیات کا مطالعہ کر سکتا۔ مثالاً دو اقتباسات پیش کرتا ہوں :۔

" عبداللہ بن عمیر کلبی نے ۔۔۔۔ کھڑے ہوکر اجازت مانگی، حضرت نے سر سے پیر تک اس کا حلیہ دیکھا، گندمی رنگ لانبا قد، مضبوط کلائیاں اور بازو چوڑی پشت اور سینہ۔ حضرت نے فرمایا بہادر اور جنگ آزما جوان معلوم ہوتا ہے، جا اگر تیرا دل چاہتا ہے۔ شیر دل جوان میدان جنگ میں آیا۔ ۔۔۔۔ پہلے ہی وار میں یسار کا کام تمام کر دیا، عبداللہ اس طرف متوجہ ہوئے تھے کہ سالم نے تلوار کا وار کیا، تلوار سر پر آچکی تھی کہ خبر ہوئی، بہادر نے بائیں ہاتھ کو سپر بنا دیا، تلوار نے انگلیاں بائیں ہاتھ کی قطع کر دیں، عبداللہ نے اتنی دیر میں پلٹ کر ایک ضرب شمشیر میں اس کا بھی خاتمہ کیا اور جوش میں یہ رجز پڑھنا شروع کر دی ۔۔۔۔ (صفحہ ۷ ۔ ۸)"

اگر یہ روایت صرف اس قدر ہوتی کہ شامی فوج سے دو شخص یساد و سالم نکلے اور ادھر سے مبارز طلبی میں عبداللہ بن عمیر نے نکل کر ان دونوں کو قتل کر ڈالا تو خیر کوئی حرج نہ تھا لیکن عبداللہ کے حلیہ کی تفصیل، امام حسین کا اس کو دیکھ کر اس کی بہادری پر رائے زنی فرمانا، لڑائی میں بائیں ہاتھ کو سپر بنانا، انگلیوں کا قطع ہو جانا (ممکن ہے بعض روایات میں انگلیوں کی تعداد بھی درج ہو) اور پھر پلٹ کر ضرب شمشیر سے دشمن کا کام تمام کر دینا۔ اس نقاشانہ رنگ کو حقیقت باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ یہ امر قرین عقل ہے کہ کسی نے ان تمام جزئیات کی تفصیل یاد رکھ کر واقعۂ کربلا کے بعد ان کو بیان کیا ہو۔

صفحہ ۱۰ پر ایک اور جنگ کا بیان ملاحظہ ہو:۔

" عمرو بن حجاج نے جو میمنۂ فوج پر تھا، حسینی فوج کے میسرہ پر حملہ کیا، جب وہ لوگ قریب پہونچے تو ان بہادروں نے گھٹنے اپنے زمین پر ٹیک دئے اور نیزے سیدھے تان لئے، دشمن کے گھوڑے نیزوں کی باڑھیں دیکھ کر اپنی جگہ ٹھہر گئے اور آگے نہ بڑھ سکے، جب وہ لوگ واپس ہونے لگے اور رخ اپنا دوسری طرف پھیرا تو انھوں نے تیروں کی بارش کر دی۔ اس سے چند آدمی ان میں سے قتل ہوئے اور چند زخمی ہوئے۔"

یہ واقعہ اس امر کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے کہ سید الشہداء کے اصحاب فن سپہگری میں کتنا کمال رکھتے تھے۔ اول تو میرا سب سے پہلا اعتراض یہی ہے کہ اس تمام تفصیل کا علم کیونکر حاصل ہوا اور اگر اسے صحیح باور کر لیا جائے تو اس میں فن سپہگری کا وہ کونسا "اعلیٰ نمونہ" تھا، جس کی مثال (بقول مصنف) تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے" سواروں کے حملہ کا جواب اہل عرب اکثر اسی صورت سے دیا کرتے تھے اس لئے عسکر حسینی نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ علاوہ اس کے صرف نیزوں کی باڑھ دیکھ کر دشمن کا واپس جانا اور وہ بھی اس انداز سے کہ

اپنی پیٹھوں کو تیروں کا آماجگاہ بنا دیں، کسی طرح قابل قبول نہیں۔

اسی طرح کی تفصیلات سے یہ رسالہ بھرا پڑا ہے اور بعض بعض واقعات کے جزئیات تو اس شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ ہم ان کو سامنے رکھ کر ایک کامیاب فلم طیار کر سکتے ہیں۔ حُر بن یزید اور اس کی جنگ کے متعلق بھی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی اسی نوع کی ناقابل قبول تفصیلات کا حامل ہے اور جناب قاسم کے واقعۂ نکاح اور ان کی معرکہ آرائیوں کے ذکر میں بھی صرف اتباع و تقلید سے کام لیا گیا ہے اور تحقیق و درایت کو اس حد تک نظر انداز کر دیا ہے کہ جناب قاسم کے بازو پر بندھے ہوئے اُس تعویذ کا ذکر بھی موجود ہے جس میں جناب حسن کی تحریری پیشین گوئی (قاسم کی شہادت کے متعلق) ملفوف تھی۔ مدعا یہ کہ یہ رسالہ معجزے، اور پیشین گوئیوں کے ذکر سے بھی خالی نہیں ہے اور اس لئے اس کی حیثیت زیادہ تر مذہبی ہو کر رہ گئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کو زیادہ موثر بنانے کے لئے بہت سی باتیں بعد کو اضافہ کی گئی ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مکروہ اضافہ خواتین (اہلبیت) کی گریہ وزاری اور بین کا ہے جن پر آج کل مجالس عزا کی رونق قایم ہے۔

فاضل مصنف نے جو کچھ اس رسالہ میں لکھا ہے وہ یقیناً سب کا سب تاریخ کی کتابوں سے ماخوذ ہے، لیکن کیا کوئی واقعہ صرف اسی لئے باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کتاب طبری اور ابصار العین میں درج ہے۔

موجودہ زمانہ میں تاریخ نگاری کی صورت وہ باقی نہیں رہی ہے جو اس سے پہلے پائی جاتی تھی یعنی اب تاریخ نگاری نام صرف تقلید و اعتماد کا نہیں ہے بلکہ انتقاد و تحقیق کا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے روایت سے پہلے اُصولِ درایت پر غور کرنا ضروری ہے۔

بہرحال جس حد تک امامیہ مشن کی تبلیغ کا تعلق ہے، یہ رسالہ اس میں شک نہیں کہ مفید و کارآمد ہے لیکن افسوس ہے کہ تاریخی حیثیت سے میں اس کو محل نظر سمجھتا ہوں۔

اثبات عزاداری امامیہ مشن کا یہ چالیسواں تبلیغی رسالہ ہے اور کوئی صاحب (سید سبط الحسن) مسودہ کے ہیں ان کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اس رسالہ کا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ عزاداری کو اہلسنت نے بھی مستحسن بلکہ ضروری قرار دیا ہے۔

اگر عزاداری کا مفہوم صرف یہ قرار دیا جائے کہ واقعۂ کربلا کے ذکر سے اسوۂ حسینی کو زندہ کیا جائے تو اس کے مستحسن ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس سے مراد، تعزیہ، تابوت، ضریح، علم، مہدی دُلدُل وغیرہ ہے یا منھ پیٹنا اور واویلا کرنا تو میرے نزدیک سوال اس کے جواز و استحسان کا پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ کہ اس بدنما داغ کو اسلام کی پیشانی سے کیونکر مٹایا جائے۔

اس رسالہ کے مولف نے جس نیت سے یہ رسالہ لکھا ہے وہ یہی ہے کہ عوام جتنے مراسم محرم میں عزاداری کے نام سے ادا کرتے ہیں وہ سب ضروری ہیں اور اس کوشش میں غریب نے کانپور کے عبداللہ علم کی جنتری اور نواب گنج کے شبراتی چودھری کے اعلان تک سے استناد کرنے میں تامل نہیں کیا۔

اس رسالہ میں جتنے اقتباسات بہ سلسلہ جواز تعزیہ داری دئے گئے ہیں ان میں سے اکثر صوفیہ کی کتابوں سے لئے گئے ہیں جن کو علمی و تحقیقی دنیا میں کوئی مرتبہ حاصل نہیں ہے اور غیر صوفی علمار کی تصانیف سے جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کا تعلق صرف ذکر شہادت سے ہے نہ کہ رسمی تعزیہ داری سے۔

روایات جو کچھ نقل کی گئی ہیں ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جن پر سب سے زیادہ اعتماد کیا گیا ہے وہ وہی ہیں جن میں شہادت حسین پر فرشتوں کی گریہ وزاری اور زمین و آسمان کی اشکباری کا ذکر ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس رسمی تعزیہ داری کا تعلق صرف جاہل طبقہ کے حسن اعتقاد سے ہے اور شیعوں کی پڑھی لکھی سنجیدہ جماعت اس کی موید نہیں ہے، لیکن امامیہ مشن کی طرف سے اس رسالہ کا شائع ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اہل علم کے ادارہ کی طرف سے بھی اس رسم کی تائید کی جاتی ہے۔

اسوقت تک امامیہ مشن کے تقریباً تمام رسایل میری نگاہ سے گذر چکے ہیں اور ان سب پر میں نے اظہار خیال کیا ہے، لیکن غالباً یہ بالکل پہلا رسالہ ہے جس کو میں بدترین کہنے میں بھی تامل نہیں کر سکتا۔ نہ اس لئے کہ اس میں رسم تعزیہ داری کی حمایت کی گئی ہے، بلکہ صرف اس لئے کہ وہ تصنیف و تالیف کے ذلیل ترین معیار سے بھی گری ہوئی ہے۔ حیرت ہے کہ جو ادارہ مولانا سید علی نقی صاحب کی تصانیف شائع کرنے کا فخر رکھتا ہو وہ تبلیغ کی ناروا سرگرمی کے سلسلہ میں اتنا پست ہو جائے کہ "اثبات عزاداری" ایسی مہمل تصانیف شائع کرنے میں بھی اسے دریغ نہ ہو۔

اسلام اور اچھوت اقوام

یہ رسالہ ہمارے فاضل دوست مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کا لکھا ہوا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ صحیح مساوات کا درس سوائے اسلام کے کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا اور اس لئے اچھوت اقوام اسلام اختیار کرنے کے بعد ہی اپنے مقصد کو حاصل کر سکتی ہیں۔

فاضل مصنف نے پہلے نفس مذہب کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے، اس کے بعد اختلاف مذاہب کے اسباب بیان کرتے ہوئے سچے مذہب کی پہچان بتائی ہے۔۔ پھر ہندو مذہب عیسائی مذہب اور اسلام کے متعلق علحدہ علحدہ اظہار خیال کرتے ہوئے واقعات تاریخ سے ثابت کیا ہے کہ کمزور قوموں کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک ہمیشہ نہایت اچھا رہا ہے اور مسلم فرمانرواؤں نے ان کے پورے حقوق دینے میں کبھی بخل و تعصب سے کام

نہیں لیا۔ مولانا اکبر شاہ خانصاحب اپنے تاریخی معلومات اور دلنشین انداز تحریر کے لحاظ سے ملک میں خاص شہرت رکھتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ اس رسالہ کو تحقیق و انشار دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہونا چاہئے لیکن ضرورت تھی کہ اس کو اس زبان و رسم خط میں شائع کیا جاتا جو اچھوت اقوام میں رائج ہے۔ اگر کوئی صاحب ہمت رکھتے ہوں تو وہ فاضل مصنف سے مکتبہ عبرت نجیب آباد (بجنور) کے پتہ پر خط و کتابت کرکے اجازت حاصل کرلیں۔ اس رسالہ کی قیمت ۴ر ہے لیکن چار جلدوں سے کم کا وی۔پی روانہ نہ ہوگا۔

تاریخ اسلام کا ابتدائی دور

مولوی برکت اللہ صاحب فاروقی نے یہ رسالہ اُردو مدارس کی ابتدائی و ثانوی جماعتوں کے لئے لکھا ہے۔ اس مختصر رسالہ میں قابل مؤلف نے نہایت اختصار و اہتمام صحت کے ساتھ تمام وہ اہم واقعات یکجا کردئے ہیں جو عہد نبوی سے لیکر خلیفۂ چہارم تک رونما ہوئے۔ ابتدا میں عرب کے عہد جاہلیت کا بھی مناسب الفاظ میں ذکر کردیا گیا ہے اور جا بجا نقشے و تصاویر دیکر کتاب کو اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ کتابت و طباعت بھی نہایت پاکیزہ ہے اور کاغذ بھی نہایت نفیس استعمال کیا گیا ہے۔ قابل مولف نے یہ کتاب غالباً بمبئی اور مدراس کے اسکولوں کے لئے لکھی ہے، لیکن یہ چیز ایسی ہے کہ اسے تمام ہندوستان کے اسلامی و اُردو مدارس میں رائج ہونا چاہئے۔ قیمت چار آنے ہے اور ملنے کا پتہ

اسلامیہ کتب خانہ نمبر ۸ — ۹، بھنڈی بازار بمبئی (۳)

جدید آمدنامہ

آمدنامہ اتنی قدیم چیز ہے کہ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو اس کے نام سے واقف نہ ہو۔ اب سے قبل جب فارسی تعلیم مسلمانوں کے یہاں ضروری خیال کیجاتی تھی تو سب سے پہلے بچے کے سامنے یہی چیز پیش کیجاتی تھی، اور اب بھی جو حضرات مشرقی امتحانات دینا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ الغرض یہ وہ اساسی کتاب ہے کہ بغیر اس کے پڑھے ہوئے کوئی شخص فارسی زبان سیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس سے قبل جو آمدنامے شائع ہوتے تھے ان میں سوائے فہرست مصادر کے اور کچھ نہ ہوتا تھا لیکن اب جدید طرز تالیف نے اس کی صورت بہت کچھ بدل دی ہے — یہ جدید آمدنامہ مولوی عبدالجلیل صاحب منشی فاضل کا مرتب کیا ہوا ہے اور جتنے آمدنامے اسوقت تک شائع ہوئے ہیں یقیناً ان میں سب سے بہتر ہے۔ ابتدا میں فارسی قواعد کے اسباق نہایت سہل و سادہ زبان میں دیدئے ہیں اور پھر تمام مصادر دیکر ان کی تمام اشتقاقی صورتیں لکھدی ہیں اور اُردو و انگریزی دونوں زبانوں میں معنے دیدئے ہیں۔

اسی کتاب کے ساتھ مجھے ایک شجرہ بھی ملا ہے جس کا نام "شجرۂ علوم ادب و لسان" ہے۔ اس میں مولوی جلیل صاحب نے صرف و نحو، بیان و بدیع کے متعلق تمام اصطلاحوں کو ترتیب وار یکجا کردیا ہے۔ آمدنامہ کی قیمت ۸ر ہے اور شجرہ کی ۲ر — ملنے کا پتہ:۔ رائے صاحب رام دیال اگروالا۔ الہ آباد ہے۔

رحلت خلفاء راشدین

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تالیف ہے جس میں خلفاء راشدین کے اخلاق انکے آخری ایام کے حالات اور وفات کی صحیح تاریخیں درج ہیں۔

فاضل مولف نے اصل عربی ماخذوں سے اس رسالہ کو مرتب کیا ہے اور انداز بیان مکالمہ کا سا ہے جس نے بہت دلکشی پیدا کر دی ہے۔ کہیں کہیں رویائے صادقہ اور پیشین گوئیوں کی قسم کے واقعات بھی درج ہیں۔ زیادہ مناسب ہوتا اگر ایسی روایتوں پر اعتماد نہ کیا جاتا اور اس رسالہ میں سوائے مورخانہ انداز بیان کے کوئی جھلک مذہبی حسن اعتقاد کی نہ پائی جاتی۔ اس رسالہ کی قیمت ۸ ہے اور ہند بک ایجنسی ۲۸۰۔ لے چیت پور یونیورسٹی کلکتہ سے ملسکتا ہے۔

فلسطین کی تحریک آزادی کے صحیح واقعات

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صیغۂ خارجہ نے ایک بلیٹن اس نام سے شایع کیا ہے جس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ فلسطین میں جو جد و جہد عربوں کی جاری ہے اس کا تعلق نہ مذہب سے ہے نہ کسی مخصوص طبقہ سے بلکہ وہ ایک مضطربانہ کوشش ہے اس امر کی کہ کسی طرح برطانوی گرفت سے ان کا ملک آزاد ہو جائے۔

اس امر کے اظہار میں کہ برطانوی امپیریلزم نے فلسطین پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کیں اور کتنی عہد شکنیوں سے کام لیا، سرکاری ممبران کی اُن تقریروں سے استناد کیا گیا ہے جو برطانوی دارالعوام میں مسئلہ فلسطین پر بحث کے دوران میں کی گئیں۔ وہ حضرات جو فلسطین کے مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنا چاہیں ان کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ ازبس مفید و کار آمد ثابت ہوگا۔ سوراج بھون الہ آباد سے اس کی کاپیاں غالباً مفت تقسیم ہوتی ہیں

ہدیۂ اخلاص بہ حضرت اقبال

مولوی محمد یحییٰ صاحب کی دو نظمیں ہیں جن میں ڈاکٹر اقبال کو مخاطب کر کے اُن کی شاعری اور شاعرانہ پیغام کو سراہا گیا ہے۔

پہلی نظم جس کا عنوان "خطاب بہ شاعر کلیم ہند" ہے جو رسالہ جامعہ دہلی میں شایع ہو چکی ہے، دوسری نظم کا عنوان "شاعر مشرق اور فلسفۂ حیات ملی" ہے یہ رسالہ اصلاح کو اشاعت کے لئے دی گئی تھی لیکن کسی وجہ سے شایع نہ ہو سکی۔ نظمیں مفہوم و شاعری دونوں حیثیت سے پاکیزہ ہیں، اور جن جذبات کو محمد یحییٰ صاحب نے ظاہر کیا ہے گو وہ کتنے ہی ذاتی کیوں نہ ہوں مخاطب کو متاثر کرنے والے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نے کیا پیغام مسلمانوں کو پہونچایا اس کا بہتر اندازہ خود ڈاکٹر اقبال کی زندگی سے ہو سکتا ہے اور اس پیغام سے قوم کو کیا فایدہ پہونچا اس کا حال مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ پنجابی مسلمانوں کی سیاسیات سے معلوم ہو سکتا ہے اس لئے محمد یحییٰ صاحب خود ہی اپنے جذبات کے ذمہ دار ہیں اور ایسی صورت میں کسی معقول وجہ کی جستجو بیکار ہے۔

یہ ہدیۂ اخلاص ۲ر میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ سے ملسکتا ہے۔

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت علاوہ محصول عا

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے قیمت علاوہ محصول عمر

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل عروج و زوال موت حیات صحت و بیماری شہرت و گمنامی وغیرہ پر صحیح پیشنگوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام زندہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں ملسکتی۔ قیمت دس آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں قیمت علاوہ محصول ۱۲

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب

۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہگئی ہیں۔ قیمت (۱۲) علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکی ہے قیمت (عہ) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جسمیں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدنی ترقی عرب سے کتنا زبردست تعلق رکھتی ہے اور دنیا کا تمدن جس شاخ سے وابستہ ہے اس کی مستند تاریخ اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت ۶ علاوہ محصول۔

صحابیات

اسمیں عہد سعادت کی ۸۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دئے گئے ہیں اسکا مقدمہ جسے مولف نے خاص اہتمام سے لکھا ہے دیکھنے کے قابل ہے اس موضوع پر اور کتابیں بھی گو مصنفین کی موجود ہیں لیکن انمیں صحابیات کے حالات کسی کتاب میں درج نہیں کئے گئے ہیں۔ قیمت ۸/ علاوہ محصول۔

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفیٰ کمال پاشا کی اس مشہور عالم کتاب کا ترجمہ جسنے یورپ ایشیا کی سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جسنے سب سے پہلے ترکی و مصر عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونک کر عالم اسلامی کے درخشاں مستقبل کو بے نقاب کر دیا تھا۔ قیمت ۶/ علاوہ محصول

عرض نغمہ

یعنی ٹیگور کی گیتان جلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جسکے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی یہ رائے تھی کہ دنیا کی کسی زبان میں گیتان جلی کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں کیا گیا اسکے شروع میں ایک نہایت ہی دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے قیمت غیر مجلد عمر علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

شاہی

تیار کردہ

طیبی

دواخانہ

یونانی

ملیریا اور ٹائیفائیڈ (موتی جھرہ)

کے بعد کمزوری دفع کرنے کیلئے

"شاہی"

لاجواب دوا ہے

ہسٹریا اور اسقاط حمل

کے

دفع کرنے میں

"شاہی"

کا مقابلہ کرے ایسی

دوا شاذونادر

ہی ہو

اینیمیا (کمی خون) دمہ

کھانسی وجملہ امراض

سینہ کے لئے

"شاہی"

اکسیر علاج

ہے

مزید معلومات کے لئے

سات سو تیار شدہ مرکبات کی فہرست مفت طلب کیجئے

طیبی دواخانہ یونانی

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳

اندور (مالوہ)

تار کا پتہ :- "شاہی" اندور

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

شاہی

تیار کردہ

طیبی

دواخانہ

یونانی